معارف

اگست ۲۰۱۹ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپے۔ فی شمارہ ۲۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۴ ماہ ذی الحجہ ۱۴۴۰ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۹ء عدد ۲

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

ایسے ممالک جہاں مختلف مذاہب کے پیروکار آباد ہوں وہاں معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ذمہ داری بنیادی طور پر وہاں رہنے والی اکثریت کی ہوتی ہے۔ جہاں اکثریت اپنی یہ ذمہ داری ادا کرتی ہے وہاں رہنے والے مختلف طبقات باہمی ہم آہنگی اور مفاہمت کے ماحول میں امن وسکون کی زندگی گزارتے ہیں اور معاشرہ کشیدگی سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن جہاں یہ ذمہ داری پوری نہیں کی جاتی اور اقلیتوں اور کمزور طبقات کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ معاشرہ باہمی ہم آہنگی اور امن وسکون کی بے بہا نعمت سے محروم رہتا ہے اور ہمیشہ ایک کشاکش کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ ایسی صورت حال میں فطری طور پر اقلیتوں اور کمزور و پس ماندہ طبقات کے مسائل بھی بڑھ جاتے ہیں اور ان کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑھ جاتی ہیں اور ان کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ خود ان اصول و آداب کی پاسداری میں کوتاہی نہ کریں جو ایک تکثیری معاشرہ میں زندگی گزارنے کے تعلق سے ان کے اوپر عائد ہوتے ہیں۔ چنانچہ جہاں یہ ضروری ہے کہ ہر قیمت پر اپنے مذہبی اور تہذیبی تشخص کی حفاظت کی جائے اور اس سلسلہ میں کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے وہیں یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ معاشرہ میں رہنے بسنے والے دوسرے طبقات کے مذہبی اور تہذیبی احساسات اور جذبات کا پورا لحاظ کیا جائے۔ ان دونوں پہلوؤں کے درمیان ایسا توازن قائم کرنا کہ ان میں سے کوئی پہلو بھی افراط و تفریط کا شکار نہ ہونے پائے بڑی ہوشمندی اور بیدار مغزی کا طالب ہے۔ یہ بات پہلے بھی کم اہم نہیں تھی لیکن ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی اہمیت اور ضرورت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اب اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ وطن عزیز میں ہمارا مقام و مرتبہ ہمارے اپنے طرز عمل اور اس حکمت عملی سے متعین ہوگا جو ہم اس ملک میں اپنے مستقبل کے تعلق سے اختیار کریں گے۔ بے احتیاطی، بے عملی اور بے سمتی کے نتائج حد درجہ خطرناک ہوں گے۔ یوں تو یہ ایک مسلسل عمل ہے لیکن کئی مواقع ایسے ہوتے ہیں جب زیادہ احتیاط اور ہوشمندی کی ضرورت ہوتی ہے اور جب ذرا ذرا سی بات پر حالات قابو سے باہر ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کی کشیدگی کا امکان جن مواقع پر زیادہ ہوتا ہے ان میں سے ایک موقع عیدالاضحیٰ کا ہمارے سامنے ہے۔

عیدقرباں جس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے اس کا حق ہے کہ اسے پوری عقیدت اور احترام سے منایا جائے۔اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ قربانی کی اس بے مثال یادگار کی اصل روح اور اس کے پیغام کو ذہن میں تازہ کیا جائے اور احکام خداوندی کی بے چوں و چرا اور مکمل اطاعت اور منشاء خداوندی کے آگے خودسپردگی کے اس جذبہ کو اپنی زندگی میں جاری وساری کرنے کی کوشش کی جائے جس کا سبق ذبح عظیم کی اس لازوال داستان سے ہم کو ملتا ہے۔ یہ عظیم الشان واقعہ معلوم تو سب کو ہے لیکن یہ بھی ایک امرواقعہ ہے کہ کم ہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دل ودماغ میں حقیقی معنی میں اس کا استحضار ہو اور اس کی یاد سے دل میں اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی کو ڈھالنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہو۔البتہ ہمارے معاشرہ میں اس کے ظاہری پہلو کی طرف بہت توجہ دی جاتی ہے۔قربانی کے لیے نہایت مہنگے داموں پر جانور خریدے جاتے ہیں اور ضروری قربانی کے علاوہ کثرت سے نفلی قربانی کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک گھر میں کئی جانور قربان کیے جاتے ہیں۔اس سلسلہ میں کئی بار مقابلہ آرائی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کی استطاعت نہیں رکھتے وہ بھی حالات کے دباؤ میں کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ایسی صورت میں اس عظیم اور مقدس عبادت کی اصل روح دب سی جاتی ہے اور توجہ بہت کچھ ظاہر پر مرکوز ہوجاتی ہے۔اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قربانی کے اوپر کثیر رقم خرچ کرنے والوں سے اگر دوسرے نہایت ضروری دینی اور ملی کاموں کے لیے تعاون مانگا جائے تو کئی مرتبہ ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے۔اس سے ہماری ترجیحات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قربانی سے وابستہ کئی امور ایسے ہیں جن کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔اس موقع پر انفرادی قربانیوں کے علاوہ اجتماعی قربانیوں کا بھی بڑے پیمانے پر اہتمام کیا جاتا ہے۔اگر قربانی سے پہلے جانوروں کو مناسب انداز میں رکھنے کا انتظام نہ کیا جائے تو آس پاس کے علاقوں میں گندگی کا پھیلنا لازمی ہے۔خاص طور سے بڑے پیمانے پر قربانی کرنے کے تعلق سے کئی ایسے مسائل ہیں جن سے مناسب انداز میں عہدہ برآ ہونا ایک مشکل کام ہے۔انفرادی قربانیاں بھی چونکہ بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لیے ان سے بھی کم وبیش یہی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔جانوروں کے ذبح کرنے سے جو خون اور دوسرا فضلہ نکلتا ہے اگر اسے مناسب انداز میں ٹھکانے نہ لگایا جائے تو بڑی گندگی اور تعفن پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔عام مشاہدہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جس احتیاط اور اہتمام کی ضرورت ہے اس کا بالعموم خیال نہیں رکھا جاتا۔نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ ہر طرف غلاظت بکھری ہوئی ہوتی ہے اور اتنا شدید تعفن پھیلتا ہے کہ راستہ چلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ مسلمان آبادیوں میں یہ چیز ایک سنگین مسئلہ کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ ملی جلی آبادیوں میں اس کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ سب ہم مدتوں سے کرتے آئے ہیں اور اب یہ ہماری آبادیوں کی پہچان بن گئی ہے۔ صفائی اور ستھرائی کے تعلق سے ہمارے سلسلہ میں ملک میں بسنے والے دوسرے طبقات کے دل ودماغ میں جو یکسر منفی تصور جڑ پکڑ گیا ہے اس کا ایک سبب ہماری زندگی کا یہ پہلو بھی ہے۔ کچھ دنوں پہلے ایک نومسلم سے یہ پوچھا گیا کہ ایمان لانے سے پہلے مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کو سب سے زیادہ ناپسند کیا چیز تھی؟ انہوں نے جواب دیا بقرعید کے موقع پر چاروں طرف پھیلی ہوئی غلاظت۔ اسلام نے طہارت اور نظافت، صفائی اور ستھرائی پر بڑا زور دیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آج گندگی اس کے پیروکاروں کی بستیوں کی علامت بن گئی ہے۔ صرف عیدالاضحیٰ ہی کے موقع پر نہیں بلکہ زندگی کے عام حالات اور معمولات میں بھی۔ اس سے سماج کے دوسرے طبقات کے دلوں میں مسلمانوں کے تعلق سے منفی جذبات پیدا ہوتے ہیں اور آپس کی دوریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس سے ہمارے مذہب کے بارے میں غلط تصورات پیدا ہوتے ہیں اور دعوت کا کام کرنے والوں کی راہ میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ دوسروں کے دل ودماغ میں اس کی شبیہ ایک ایسے مذہب کی حیثیت سے ابھرتی ہے جس کے ماننے والے صفائی ستھرائی پر یقین نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ گھر کی گندگی باہر پھینک دیتے ہیں۔ اگر اس سے ماحول خراب ہوتا ہے اور آنے جانے والوں کے لیے یہ تکلیف اور اذیت کا باعث بنتا ہے تو ان کو اس کی چنداں پروا نہیں۔ ہماری یہ شبیہ اہل وطن کے دماغ میں پختہ ہوچکی ہے۔ یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے۔ ہم اپنے اہل وطن کو اپنی مثال اور اپنے کردار سے اسلام کے قریب لانے کے بجائے انہیں اس سے دور کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ آیئے اس عیدالاضحیٰ سے اس رجحان کو بدلنے کے لیے سنجیدہ کوشش کا آغاز کریں اور اس سلسلہ میں جس قدر اہتمام ممکن ہو اس سے دریغ نہ کریں۔ قربانی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی غلاظت کو ادھر ادھر پھینکنے کے بجائے احتیاط سے زمین میں دفن کردیا جائے۔ اس سلسلہ میں نوجوانوں کو خاص طور سے آگے آنا چاہیے۔ اب مستقبل کے تعلق سے جو امیدیں ہیں وہ انہی سے ہیں۔ انہیں اس بات کو یقینی بنانے کی ہرممکن کوشش کرنی چاہیے کہ عیدقرباں کے مقدس تہوار کے ساتھ وابستہ گندگی کا تصور اب ختم ہو اور اس نہایت پاکیزہ موقع کو اس کی پاکیزگی کے لیے یاد کیا جائے۔

مقالات

ردعیسائیت اور علمائے جنوب

☆ڈاکٹر راہیؔ فدائی

افراد ہوں کہ اقوام اپنے فیصلوں میں خودمختار ہوتے ہیں، بسا اوقات ان کے فیصلے صدیوں پر محیط اور آنے والی نسلوں کو متاثر کرنے کے علاوہ "اک لحہ غافل گشتم وصد سال راہم دور شد" کے مصداق ماضی کی ذراسی بھول چوک کا خمیازہ مستقبل کو اٹھانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ جب میسور کی عظیم سلطنت، سلطنت خداداد کا زوال اس کے شیر دل حکمراں ٹیپو سلطان کی شہادت ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۹ء کے بعد ہوا تو انگریز حکمرانوں نے سلطان شہید کے اہل خانہ اور سری رنگ پٹن کے قلعے میں موجود تمام خویش و اقارب کو صوبہ آرکاٹ کے مشہور شہر ویلور منتقل کرکے وہاں کے مضبوط اور وسیع و عریض قلعے میں نظر بند کردیا جہاں انگریزی افواج کی چوکسی کے باوجود نظر بندی کے سات سال بعد ۱۰؍جولائی ۱۸۰۷ء کو انگریزی حکومت کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی مگر افسوس کہ یہ بغاوت صحیح منصوبہ بندی نہ ہونے اور بے وقت اور عجلت میں لیے گئے غلط فیصلوں کی وجہ سے ناکامی کا شکار ہوگئی (۱)۔ اس کا خمیازہ نہ صرف قلعے میں محصور شاہی خاندان کے افراد کو اٹھانا پڑا بلکہ اس کی پاداش میں سینکڑوں ہندوستانی سپاہی انگریزی فوجوں کے مقابلے میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے جن میں ہندو، مسلمان سبھی شامل تھے، یہ بغاوت جنگ آزادی کے سلسلہ کی اولین بغاوت تھی جسے سپائیس میوٹنی (Spoys Mutiny) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۲) یہ معرکہ "غدر ویلور" شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء میں واقع تحریک آزادی کی بغاوت سے نصف صدی پیشتر ہوا تھا۔ اس کے بعد حکام نے ٹیپو سلطان کے شہزادوں اور افراد خاندان میں سے بعض کو جن سے انہیں خدشہ تھا، ویلور سے بہت دور کلکتہ روانہ کردیا۔ انہیں میں سے سلطان ٹیپو شہید کے پوتے نواب بشیر الدین توفیقؔ میسوری (متوفی ۱۳۰۲ھ

☆ڈاکٹر راہی فدائی نمبر ۲۱، تیسرا کراس، عثمان اسٹریٹ، خوش حال نگر، کے جی ہلی، بنگلور۔

بمقام کلکتہ) ابن نواب شکراللہ بھی تھے جنہیں مرزا غالبؔ سے تلمذ کا اعزاز حاصل تھا، ان کی اولاد آج بھی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گذارنے پر مجبور ہے، البتہ نواب حیدر علی خاں مرحوم کی دوسری منکوحہ محترمہ بخشی بیگم (ہمشیرۂ نواب عبدالحلیم خاں میانہ والیِ کڈپہ)، حضرت ٹیپو سلطان کی اہلیہ، بیٹیوں اور دامادوں اور بعض خواتین وضعیف اشخاص کو قلعہ ویلور ہی میں رہنے دیا، جن کے مزار ویلور شہر کے گورستان شاہی میں موجود ہیں اور ان پر سنگی کتبے نصب ہیں۔

سلطنت خداداد کے سقوط کے بعد انگریزوں نے اپنی حکومت پورے ہندوستان پر مضبوط و مستحکم کرلی، چنانچہ وسیع و عریض قدیم صوبۂ کرناٹک کی والاجاہی حکومت کے بانی نواب محمد علی والا جاہ گوپاموی (عہد حکومت ۱۱۶۳ھ تا ۱۲۱۰ھ) ابن نواب انورالدین شہامت جنگ شہید (شہادت ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء) اور ان کے حلیف انگریزی افواج کے درمیان عہد نامۂ امن و آشتی رقم کیا گیا پھر نواب غلام حسین عمدۃ الامرا کے دور (۱۲۱۰ھ تا ۱۲۱۶ھ) کے بعد نواب عبدالعلی عظیم الدولہ (عہد ۱۲۱۶ھ تا ۱۲۳۵ھ) صوبۂ کرناٹک کے فرمانروا ہوئے تو انہوں نے ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں ایک نئے معاہدہ کے تحت سیول اور ملٹری نظم و نسق کے تمام اختیارات انگریزی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کرنے میں ہی عافیت سمجھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام صوبۂ کرناٹک میں جنگ وجدال کی بجائے بظاہر امن وسکون کا ماحول پیدا ہوگیا۔(۳)

اس واقعہ کے پانچ دہائیوں بعد شمالی ہند میں ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف زبردست بغاوت رونما ہوئی جس میں عوام وخواص سبھی شامل تھے، علماء نے اپنے تعلیمی وتدریسی مشاغل اور اصلاح وارشاد کی مصروفیتوں کو پس پشت ڈال کر جنگ آزادی میں عملاً حصہ لیا، جس کے مثبت ومنفی اثرات کا تاریخ کے صفحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شمالی ہند کے سنگین حالات کو دیکھتے ہوئے جنوب کے اہل علم واہل فضل نے یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ حالت میں حکومت سے براہ راست مقابلہ کرنا خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔ جب کہ حکومت شریعت مطہرہ میں مداخلت نہیں کررہی ہے۔اس بات کا اظہار بھی جنوبی ہند کے بلند پایہ صوفی، حضرت سید شاہ محی الدین عبداللطیف قادری نقوی معروف بہ قطب ویلور (ولادت ۱۲۰۷ھ وفات ۱۲۸۹ھ) نے ویلور کے اسپیشل کمشنر لوائن صاحب کے نام بتاریخ ۱۶؍شوال ۱۲۵۵ھ مطابق

۲۳/دسمبر ۱۸۳۹ءایک طویل مکتوب میں کیا تھا:

”اہل اسلام کی شرع میں جو حاکماں کہ مانع بانگ وصلوٰۃ اور احکام شرعی نہیں ہیں، ان سے جہاد کرنے کا حکم نہیں ہے، پس اس صورت میں کیوں کر کوئی خلاف شرع جہاد کی تجویز دے گا“۔(۴)

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ علمائے جنوب نے انگریزوں کے تمام معاملات میں نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا، بلکہ جب حکومت کی درپردہ تائید سے مذہب عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی اور عیسائی مشنریوں نے حکومت کی شہ پر عیسوی تبلیغ کا جال جابجا پھیلا دیا تو علماء نے ان کا مسکت و دنداں شکن جواب دیا، جس کی وجہ سے مشنریوں کا زور ٹوٹنے لگا اور ان کی سازشیں طشت از بام ہونے لگیں، اس صورت حال میں حکومت ان حق گو علما کے بلند اخلاق واعلیٰ کردار اور عوام الناس پر ان کے اثر ورسوخ کے سبب مداخلت کرنے سے باز رہی اور علمائے کرام کو اپنے مذہب کی مدافعت میں تقریر وتحریر کی کھلی آزادی حاصل رہی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں اشاعت دین کا جذبہ فروغ پاتا رہا، برادران وطن حلقہ بگوش اسلام ہوتے گئے، خصوصاً جنوبی ہند کے پچھڑے طبقہ کے لوگ اور دلت قوم کے افراد مسلمانوں کی رواداری، بھائی چارہ اور مساوات کے متعلق ان کی اپنی مادری زبان میں تقریریں سن کر اور اپنی آنکھوں سے مسلم معاشرے کے میل ملاپ اور جذبۂ اخوت کو دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہوتے رہے۔

باوجود ان حالات کے عیسائی مبلغین اپنا کام کرتے رہے اور ان کی مشنریاں اسلام کے خلاف کاروبار کذب وافترا چلاتی رہیں۔ بقول مشہور مستشرق گارساں دی تاسی:

”اس سچے مذہب مسیحیت کی ترقی اس قدر تیزی سے نہیں ہورہی ہے جیسی کہ ہونی چاہیے تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کام کیا جارہا ہے وہ نہایت ٹھوس ہے“۔(۵)

”ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحی مبلغین کو زیادہ کامیابی ابھی نہیں حاصل ہوئی لیکن بعض مسلمانوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کرلیا“۔(۶)

مسلمانوں میں عیسائی مبلغین کو خاطر خواہ کامیابی اس لیے حاصل نہیں ہوئی کہ علماء نے پہلے ہی سے تبلیغ عیسائیت کے تدارک کے لیے مناسب تدابیر اختیار کر رکھی تھیں، بقول مولانا یوسف کوکن عمری:

> ”جنوبی ہند اور خاص کر صوبہ مدراس میں انگریزوں کے تسلط کی بنا پر عیسائیت کا بڑا چرچا ہونے لگا تھا، پادری نہ صرف عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے بلکہ اسلام اور شارع اسلام پر حملے بھی کرتے جارہے تھے، وہ توریت، زبور اور انجیل سے حوالے دیتے تھے اور عیسائی تعلیمات کی برتری پر مختلف دلائل پیش کررہے تھے، اس زمانے میں توریت، زبور اور انجیل کا ترجمہ اردو میں تو کجا بلکہ فارسی میں بھی نہیں ہوا تھا، عام مسلمان عربی زبان سے اتنے زیادہ واقف نہیں تھے، فارسی یہاں کی عام زبان تھی، عیسائی مبلغین کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر قاضی نظام الدین احمد صغیر نے محسوس کیا کہ عربی تورات، زبور اور انجیل کا کم از کم فارسی میں ترجمہ کیا جائے تا کہ اس دین کی حقیقت سے عام مسلمان براہ راست واقفیت حاصل کرسکیں“۔(۷)

مولانا قاضی نظام الدین صغیر (ولادت ۱۱۱۳ھ وفات ۱۱۸۹ھ) بن مولانا عبداللہ شہید (شہادت ۱۱۴۵ھ در ”تاراپتری“ صوبہ آندھرا) بن قاضی نظام الدین کبیر، صاحب تصنیف اور صوفی مزاج بزرگ تھے، نواب سعادت اللہ خاں والی کرناٹک کے دور اقتدار (۱۱۲۲ھ تا ۱۱۴۵ھ) میں دارالسلطنت محمد پور (موجودہ آرکاٹ) کی قضات وصدارت انہیں تفویض کی گئی تھی، ساتھ ہی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی باقی رہا، آرکاٹ کی نائطی حکومت کے اختتام کے بعد قاضی صاحب کرناٹک کی ”والا جاہی“ حکومت سے وابستہ ہوگئے، قاضی نظام الدین نے یہ محسوس کیا کہ انگریز کرناٹک پر اپنا تسلط قائم کرنے کے درپے ہیں جس کی وجہ سے عیسائی مبلغین کے لیے یہاں راہ ہموار ہورہی ہے، اس فتنے کو بھانپ کر قاضی صاحب نے یہودیوں اور عیسائیوں کی تردید کے لیے ۱۱۵۳ھ مطابق ۱۷۴۰ء میں عربی زبور کا ترجمہ فارسی میں ۵۶۲ صفحات پر کیا، جس کا نام ”سرور الصدور ترجمۃ معرب الزبور“ رکھا، پھر اس کے بعد انہوں نے عربی انجیل کا ترجمہ زبان فارسی میں ”فیض الجلیل فی ترجمۃ الانجیل“ کے نام سے کیا، تا کہ عوام وخواص سبھی براہ راست ان کتابوں کو پڑھ کر مبلغین کی دروغ گوئی اور افترا پردازی سے آگاہ ہوجائیں (۸)۔ اس وقت آرکاٹ پر سعادت اللہ خاں کے بھتیجے نواب دوست علی خاں نائطی (۱۱۴۵ھ تا ۱۱۵۳ھ) کی حکومت تھی۔ یہاں

یہ بات قابل غور ہے کہ بارہویں صدی ہجری یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں انجیل کا عربی متن موجود تھا جس کی بنیاد پر قاضی نظام الدین نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا تذکرہ سطور بالا میں گذرا، مگر مولانا محدث حبیب الرحمن اعظمی کے بیان کے مطابق جو ماہنامہ ''معارف اعظم گڑھ'' (جلد ۲۱، شمارہ ۴) میں شائع ہوا تھا، عربی کے ایک فاضل شیخ جواد ساباط (ولادت ۱۱۸۸ھ وفات ۱۲۵۰ھ) ابن محترم ابراہیم ساباط نے دمشق سے سیاحت کرتے ہوئے علاقہ مدراس پہنچ کر انگریزی سیکھی اور عیسائی مشنریوں کی کارستانیوں سے واقف ہوکر بظاہر ارتداد اختیار کرتے ہوئے ''برٹش اینڈ فارنر بائبل سوسائٹی'' (British and Forigner Bible Society) کی ملازمت قبول کرلی اور ''انجیل'' کا عربی ترجمہ کئی سالوں کے محنت شاقہ کے بعد ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں مکمل کیا۔ اس کے بعد فارسی ترجمہ بھی کرڈالا (۹)۔ یہاں یہ سوال پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے کہ مدراس میں انجیل کا عربی ترجمہ ستر سال پیشتر ہوچکا تھا تو پھر کس لیے شیخ جواد ساباط کو مدراس میں رہ کر عربی ترجمہ کی زحمت اٹھانی پڑی؟ حالانکہ قاضی نظام الدین صغیر نے زبور اور انجیل کے ترجمے عربی متن کے ساتھ کیے تھے، اس سوال کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گذر جانے کی وجہ سے مذکورہ ترجمے نایاب ہوگئے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قاضی نظام الدین صغیر کی مذکورہ ردعیسائیت پر مشتمل کاوشوں کا مثبت اثر بہت دیر تک ان علاقوں میں باقی رہا، چنانچہ ان کے پوتے مولانا محمد غوث شرف الملک بہادر (متوفی ۱۲۳۸ھ) بن مولانا مفتی ناصر الدین محمد (متوفی ۱۲۰۶ھ) کے فرزند مولانا محمد صبغۃ اللہ معروف بہ قاضی بدرالدولہ (ولادت ۱۲۱۱ھ وفات ۱۲۸۰ھ) کے زمانے میں ایک عام پڑھے لکھے شخص محمد ہادی نے ۱۲۴۲ھ میں کسی امیر کی دعوت کی محفل میں شریک عیسائی ''گڈون'' (Goodwin) سے گفتگو کرتے ہوئے دین اسلام پر اس کے اعتراضات کا مسکت ومدلل جواب تورات وانجیل سے دے کر اسے اپنا قائل کرلیا، اور وہ عیسائی مشرف بہ اسلام ہوا تو اس کا نام مرزا ہدایت بیگ رکھا گیا۔ (۱۰)

قاضی بدرالدولہ بن شرف الملک نابغۂ روزگار عالم دین، اور مشہور صاحب قلم بزرگ تھے، کرناٹک کی والا جاہی سلطنت کے چوتھے حکمراں نواب اعظم جاہ (متوفی ۱۲۴۱ھ) بن نواب عظیم الدولہ (متوفی ۱۲۳۴ھ) نے ان کو ۹؍جمادی الآخر ۱۲۳۸ھ کو ملک کا صدرالصدور مقرر کیا تھا، بعد ازاں

نواب غلام غوث خاں بہادر والا جاہ پنجم (متوفی ۱۲۷۳ھ) بن اعظم جاہ نے اپنے دور حکومت میں ان کو ریاست کرناٹک کے ''قاضی القضاۃ'' کے منصب اعلیٰ پر فائز کیا اور استاد محترم ہونے کے سبب سے دربار میں نذر گزاری سے مستثنیٰ قرار دیا (۱۱)۔قاضی بدر الدولہ نے بچپن میں ملا عبدالعلی بحر العلوم (متوفی ۱۲۲۵ھ) سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی، پھر بحر العلوم کے داماد اور جانشین ملک العلماء ملا علاء الدین احمد (متوفی ۱۲۴۲ھ) سے معقولات پڑھی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے چشم و چراغ شیخ سلام اللہ محدث رامپوری حنفی (متوفی ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۳ھ) کے شاگرد رشید مولانا محمد ابراہیم رامپوری سے صحاح ستہ اور موطا امام مالک کی سندیں حاصل کیں، مشہور محدث شیخ ابوعبیدہ محمد بن محمد غلام مکی (متوفی ۱۲۴۴ھ درمدراس) نے ان کو حدیث مسلسل بالاولیت اور حدیث مسلسل بالمصافحہ کی سندیں عطا کیں، علاوہ ازیں قاضی بدر الدولہ نے علم قرأۃ وتجوید اپنے والد شرف الملک بہادر سے حاصل کیا، بعد ازاں قاری شیخ منصر زبیدی (متوفی ۱۲۵۸ھ) اور قاری سید علی (متوفی ۱۲۴۷ھ) ابن سید عبداللہ الحموی البغدادی سے استفادہ کرتے ہوئے اس فن میں کمال حاصل کیا (۱۲)۔قاضی صاحب بہترین مناظر تھے، اس دور کے پادریوں سے کامیاب مناظرے کیے جس کی روداد مختصر رسائل کی شکل میں شائع ہوتی رہی، دین اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مسیحی علما نے جو اعتراضات کیے تھے، اس کا اس طرح مدلل جواب دیا کہ پھر ان پادریوں اور مسیحی اہل علم کو چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔قاضی بدر الدولہ نے ۱۲۵۱ھ میں ان مسیحی علما کے دعووں کی تردید میں ۸۴ صفحات کی ایک کتاب لکھی جس کا نام ''سیف المسلمین لھدایۃ الکافرین'' رکھا جو شائع ہوکر کافی مقبول ہوئی۔(۱۳)

مولانا قاضی نظام الدین صغیر کی وفات (۱۱۸۹ھ) کے ٹھیک اٹھارہ سال بعد جنوبی ہند کے شہر ویلور (موجودہ ٹمل ناڈو) میں مولانا سید شاہ محی الدین عبداللطیف نقوی معروف بہ قطب ویلور پیدا ہوئے، حضرت قطب ویلور (ولادت ۱۲۰۷ھ وفات ۱۲۸۹ھ) بلند پایہ صوفی اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، بقول مولانا شاہ محمد ولی اللہ قادری تلمیذ علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۱۳۰۴ھ) ''قطب الاقطاب کے آٹھ لاکھ مرید اور چار سو خلفا تھے'' (۱۴) علاوہ ازیں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بھی ملک بھر میں شہرت رکھتے تھے، ان کی تصنیفات میں سلوک وتصوف میں

''جواہر الحقائق'' (تصنیف شدہ ۱۲۷۳ھ)، غایۃ التحقیق (۱۲۸۰ھ)، جواہر السلوک (۱۲۸۱ھ) اور اصلاح وارشاد میں ''احیاء السنۃ'' (۱۲۶۹ھ)، خلاصۃ العلوم (۱۲۷۳ھ) اور ''فصل الخطاب فی الفرق بین الخطاء والصواب'' (۱۲۷۷ھ) وغیرہ کتابیں شائع ہوکر مقبول خاص و عام ہوئیں۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں تصنیفی خدمات انجام دیں، اپنے قیام مکہ ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء کے دوران حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۴۸ھ) کی معرکہ آرا تصنیف ''تحفۂ اثناعشریہ'' (مرقومہ ۱۲۱۵ھ) کا عربی میں ترجمہ کیا اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے نواسے شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی (متوفی ماہ رجب ۱۲۶۲ھ) ابن افضل فاروقی دہلوی سے تبرکاً سند حدیث ماہ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۳ھ میں حاصل کی (۱۵)۔ ردعیسائیت میں قطب ویلور کے کارنامے نا قابل فراموش ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے علوم دینیہ معقولات ومنقولات کے علاوہ انگریزی زبان بھی سیکھی اور اس زبان میں اس قدر استعداد حاصل کی کہ بآسانی انگریزی کتابیں پڑھ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے براہ راست انگریزی بائبل کا مطالعہ کرکے اس میں سے تین سو تناقض نکال کر تین سو (۳۰۰) اعتراضات پیش کیے اور انہیں مرتب شکل میں چرچ اور مشنری کے ذمہ داروں کو روانہ کیا، جیسا کہ ان کے اولین تذکرہ نگار اور خلیفہ مولانا شاہ عبدالحی احقرؔ بنگلوری (متوفی ۱۳۰۱ھ) نے اپنی مثنوی ''مطلع النور'' میں تحریر کیا ہے:

''عیسوی دین کے کتب اے ذکی　　جو کہ ہیں در زبان انگریزی
کرکے ان کا مطالعہ اکثر　　جرح کرنے لگا بہت جابر
تاحدے کہ وہ نکو منوال　　تین سو تک تناقض اس سے نکال
تین سو اعتراض بھی لکھا　　دیکھ حیران ہوگئے علما'' (۱۶)

قطب ویلورؒ کے اعتراضات پڑھ کر مسیحی مبلغین خاموش ہوگئے، حضرت قطب ویلور کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انہوں نے حکومت برطانیہ کی حکمران ملکہ وکٹوریہ کو انگریزی ہی میں مراسلہ تحریر کرکے اسلام کی دعوت پیش کی، جس کا اعتراف کرتے ہوئے صاحب ''نزہۃ الخواطر'' مولانا حکیم سید عبدالحی لکھنوی نے لکھا:

''وھو تلقی اللغۃ انکلیزیۃ فی کبر سنہ وبعث رسالۃ تلك اللغۃ الی الملکۃ

انکلیزا یدعوھا الیٰ الاسلام ‘‘(۱۷)

(یعنی انہوں نے بڑی عمر میں انگریزی زبان سیکھی اوراسی زبان میں ملکہ کی خدمت میں اسلام پیش کرتے ہوئے مکتوب روانہ کیا۔)

قطب ویلور کے مکتوب کا جواب دیتے ہوئے ملکہ وکٹوریہ (دوراقتدار ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۱ء) نے تحریر کیا کہ ’’مذہب اسلام دین برحق ہے مگر چند وجوہ کی بنا پر وہ اسلام قبول کرنے سے قاصر ہے‘‘(۱۸) قطب ویلور نے ملکہ کے نام تحریر کردہ اس خصوصی خط کے علاوہ ایک عمومی عربی مکتوب بھی ملکہ اور اس کے وزرا و امرا کے نام روانہ کیا تھا جس کا تذکرہ خط کے متن کے ساتھ ’’مقالات طریقت‘‘ میں موجود ہے۔ یہاں اس مکتوب کے مختصر اقتباس کا ترجمہ پیش ہے:

یعنی اے ملکہ! حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی جانب سے معجزات لے کر آئے تھے اور آپ مٹی سے پرندے کی مورت بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ پرندہ حکم خداوندی سے زندہ ہوجاتا تھا اور آپ مادرزاد نابینا اور کوڑھی کو صحت یاب کردیتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردہ تن میں جان ڈال دیتے تھے، جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر کو چیر دیا تھا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے دوٹکڑے کردیے تھے، غرض یہ سب انبیاء کرام کے معجزات اور معزز و مقدس کتابوں کے ساتھ تشریف لائے تھے اور سبھی نے کہا تھا، بے شک اللہ تعالیٰ ہمارا اور تمہارا پروردگار ہے، پس اسی کی عبادت کرو اور یہی سیدھی راہ ہے۔

اے ملکہ! حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش بغیر ماں باپ کے ہوئی تھی پھر کیوں کر حضرت عیسیٰ خالق و رب ہوسکتے ہیں۔

اے ملکہ! حضرت عیسیٰ کو یہودیوں نے مغلوب کررکھا تھا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے، پس بندۂ مغلوب کیسے خدا اور معبود ہوگا؟(۱۹)

علاوہ ازیں حضرت قطب ویلور نے اپنے تلامذہ اور مریدین و معتقدین کو خطوط و مراسلات کے ذریعہ ردّ عیسائیت پر دلائل فراہم کرتے ہوئے انہیں باشعور و باہنر بنانے کی سعیٔ مشکور کی جس کے شواہد حضرت کے خلیفہ اور ہمشیرزادہ و داماد مولانا سید شاہ محمد قادری کے مرتب کردہ مجموعہ ’’مکتوبات لطیفی‘‘ (قبل ۱۲۸۹ھ) میں موجود ہیں، ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ صدیوں سے بندرہی ایک عظیم

سنت کو زندہ و تابندہ کر کے گویا ملک کے تمام داعیان اسلام کی جانب سے فرض کفایہ ادا کیا، چنانچہ ہندوستان کے راجاؤں، غیر مسلم حاکموں اور وزرا و امراء کے نام ان کی اپنی مادری زبان میں ناصحانہ خطوط لکھوا کر اسلام کی دعوت اس نہج پر دی جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے حکمرانوں کو مراسلوں کے ذریعہ دعوت اسلام پیش کی تھی، قطب ویلور نے اپنے خلفا مولانا میر ابراہیم رضوی، مولانا شاہ عبداللہ مشاقؔ حیدرآبادی (مصنف جامع المظاھر فی منتخب الجواھر مطبوعہ ۱۲۹۱ھ)، مولانا سید حفیظ الدین سورتی، مولانا سید علی وغیرہ کو اس کام کے لیے مامور فرمایا تھا جس کی تفصیل مرقومہ ۱۲۸۵ھ کے مکتوب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مولانا شاہ عبداللہ حیدرآبادی کو خصوصی ہدایات دیتے ہوئے لکھا کہ:

> ''دعوت اسلام کے مکتوبات دو طرح کے ہیں، راجاؤں کے نام اور تمام مشرکوں کے نام، راجاؤں کے نام تحریر کردہ مکتوبات میں خالی جگہ میں مدعو راجا کا نام اور موضع لکھیں، کتابت کر کے عزت و احترام کے ساتھ کسی صاحب علم اور ذی اخلاق شخص کے ذریعہ روانہ کریں اور ہمیشہ اصلاح و دعوت میں مصروف و مشغول رہیں، اصل کام تو یہی ہے۔ باقی سب ہیچ ہے'' (۲۰) (ترجمۂ فارسی مکتوب)

حضرت قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) کے نامور خلفا میں باب العلوم شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری (متوفی ۱۳۳۷ھ مطابق جنوری ۱۹۱۹ء) کی ذات گرامی اس لیے اہم اور ممتاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے جدید تقاضوں سے آراستہ ہندوستان کا اولین مدرسہ بنام مدرسہ باقیات صالحات ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں جنوبی ہند کے مردم خیز قطعہ شہر ویلور (ٹمل ناڈو) میں قائم فرمایا، اسی شہر ویلور میں ان کی ولادت ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں ہوئی، ان کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ شیخ عبدالقادر آتوری (متوفی ۱۲۵۱ھ) حضرت قطب ویلور کے پدر بزرگوار صاحب کشف و کرامات حضرت سید شاہ محویؔ ویلوری (متوفی ۱۲۴۳ھ) کے خلیفۂ خاص تھے، شاہ محویؔ نے شیخ آتوری کو متاھل ہونے کے باوجود ویلور میں موجود اپنے ایک اور خلیفہ مولانا شاہ محمد امین قادری کی دختر فاطمہؔ سے نکاح کرنے پر یہ کہہ کر آمادہ کیا کہ تمہارے یہاں ایک لڑکا ہوگا جس سے جنوب بعید میں دور دور تک علمی فیضان پہنچے گا، چنانچہ فاطمہ کے بطن سے شاہ عبدالوہاب تولد ہوئے جو ''وہاب

العلوم" کے لقب سے علمی دنیا میں مشہور ہوئے۔شاہ عبدالقادر آتوری پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۴۶ھ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ) کی فارسی تفسیر کا عربی ترجمہ "التعریب القادری للتفسیر العزیزی" کے نام سے کرتے ہوئے افکار ولی اللٰہی کا تعارف جنوب بعید کے اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا۔(۲۱)

شاہ عبدالوہاب قادری کی امتیازی شان یہ ہے کہ انہوں نے اس دور میں عیسائیت کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو عین جوانی میں محسوس کرتے ہوئے اپنے شفیق استاذ علامہ حکیم شاہ زین العابدین مائل قادری (متوفی ۱۲۹۷ھ) کے مشورہ سے سن ۱۲۶۸ھ میں اپنے وقت کے مشہور مناظر حضرت علامہ رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۰۸ھ) کی خدمت میں کرانہ (یوپی) جیسے دور دراز مقام تک پہنچ کر اکتساب فن کیا،اس وقت آپ کے ہم درس ساتھیوں میں مولانا عبدالسمیع بے دل رامپوری (مصنف حمد باری وانوار ساطعہ) بھی تھے (۲۲)،یہی وجہ ہے کہ جب قیام مدرسہ کے بعد ۱۲۸۴ھ میں شاہ عبدالوہابؒ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو کر مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور حج وزیارت سے فراغت پا کر ۱۲۸۶ھ میں واپس لوٹنے لگے تو استاذ محترم مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے جو ۱۸۵۷ھ کے خون آشام حالات کے بعد ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ آچکے تھے،ردّ عیسائیت میں تحریر کردہ اپنی گرانقدر تصنیف "ازالۃ الشکوک" کا دو جلدوں پر محیط مسودہ اپنے چہیتے شاگرد کے حوالے کرتے ہوئے اسے ایڈٹ کرنے اور طبع کرنے کی ذمہ داری بھی دے دی،چنانچہ عبدالوہاب نے استاذ کے منشا کے مطابق دو سال کے عرصے میں اس کی تصحیح سے فراغت حاصل کر لی بقول ان کے:

"تصحیح اس دوسری جلد کی مع جلد اول "ازالۃ الشکوک" کے بشراکت محبی محمد یعقوب خاں صاحب سلمہ تعالیٰ حوالدار پیش کر کے فقیر عبدالوہاب کان اللہ لہ ولاسلافہ نے شعبان المعظم ۱۲۸۸ھ میں تمام کیا"۔(۲۳)

دونوں جلدوں کی تصحیح مکمل ہونے کے باوجود طباعت کی نوبت بہت دیر بعد آئی،چنانچہ جلد اول ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں اور جلد دوم ۱۳۲۷ھ کے بعد زیور طباعت سے آراستہ ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ بانیٔ باقیات شاہ عبدالوہاب کے سفر حج سے پیشتر ان کے مربی ومرشد حضرت قطب ویلور نے ۱۲۸۲ھ میں ان کو عطائے خلافت سے سرفراز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اسے طبع

کرواکر منظر عام پر لے آئیں، بانی مدرسہ باقیات نے مرشد کے حکم کی تعمیل میں اپنے ایک معتقد جناب بابامیاں تاجر کوترغیب دے کر ۱۲۸۳ھ میں مطبع مظہر العجائب، مدراس سے چھپوایا تھا (۲۴)۔ ''جواہر السلوک'' ۲۴۳ صفحات پر مشتمل ضخیم تصنیف ہے،اس کی طباعت کے بعد چار سال کی مدت میں ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب ''ازالۃ الشکوک'' کو طباعت کے مراحل سے گزارنا اور منصۂ شہود پر لے آنا اس زمانے میں انتہائی مشکل کام تھا،علاوہ ازیں بانی باقیات شاہ عبدالوہاب کو ۱۲۸۶ھ میں سفر حج سے واپسی کے بعد مدرسہ کی تشکیل جدید کا مرحلہ درپیش تھا، پھر چھ سال بعد طلبہ کی کثرت کی وجہ سے صحن مسجد میں جاری مدرسہ کو ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں مسجد سے ملحق ایک مستقل عمارت تعمیر کر کے منتقل کیا گیا، بعد ازاں ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں مدرسہ باقیات کے قوانین رجسٹر کیے گئے اور اسی سال مدرسہ کا پہلا سالانہ جلسۂ دستار بندی کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں بطور مہمان خصوصی دارالعلوم دیوبند (قائم شدہ ۱۲۸۳ھ) کے صدر مدرس ابوالخیرات سید احمد دہلوی (متوفی مابعد ۱۳۰۸ھ) تلمیذ امام بخش صہبائیؔ و مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے شرکت کی تھی (۲۵)۔ مدرسۂ باقیات کے اولین جلسہ کے تقریباً ۱۹ سال بعد ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں دوسرا جلسۂ دستار بندی بڑے ہی آب و تاب کے ساتھ منعقد ہوا، پھر اس کے دو سال بعد ''ازالۃ الشکوک'' کی پہلی جلد ۱۳۲۶ھ میں باہتمام و باصرف خاص ابوالفضل علامہ قاری ضیاء الدین محمد قادری (متوفی ۱۳۶۰ھ) ابن شمس العلماء مولانا شاہ عبدالوہاب قادری شائع ہوئی، خان بہادر ضیاء الدین محمد مدرسہ باقیات سے ۱۳۰۵ھ میں فراغت کے بعد مدرسہ صولتیہ (قائم شدہ ۱۲۹۱ھ) مکہ مکرمہ میں داخل درس ہو کر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے تلمیذ خاص رہے، مکہ مکرمہ سے ہندوستان آ کر انہوں نے والد ماجد کے ہمراہ مدرسہ باقیات کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی سنبھالتے ہوئے ایک کامیاب تاجر چرم کی حیثیت سے بھی شہرت پائی۔ موصوف نے ''ازالۃ الشکوک'' کی دوسری جلد اپنے صرف خاص سے طبع کروائی، دونوں جلدوں کی اشاعت میں اس قدر تاخیر کا سبب جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا گیا مدرسہ کی مسلسل مصروفیات اور مالی مسائل تھے، مدرسہ باقیات جہاں جنوب بعید کے دور دراز ممالک سیلون، ملیشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، مالدیپ، ویت نام، چین وغیرہ کے طلبہ زیر تعلیم تھے، ان کی علمی و مالی کفالت بہت بڑا مسئلہ تھا، ان دشواریوں کا اندازہ نہ ہونے کے سبب مولانا عتیق احمد قاسمی، استاذ حدیث وفقہ،

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو نے لکھا:

"مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد حضرت مولانا کیرانوی نے وہاں ایک معیاری دینی مدرسہ قائم کرنے کی فکر فرمائی اور یہ فکر ان کے دل و دماغ پر مستولی ہوگئی، مولانا مرحوم کی توانائیوں اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ اس میں صرف ہونے لگا، آپ کی کوششوں سے "مدرسہ صولتیہ" قائم ہوا جو اس زمانے میں حجاز کا بڑا تعلیمی مرکز تھا، الحمدللہ آج بھی اس کا فیض جاری ہے۔ ان حالات اور مصروفیات کی بنا پر حضرت مولانا کیرانوی "ازالۃ الشکوک" کی طباعت و اشاعت کی طرف توجہ نہیں کر سکے، مولانا کیرانوی کے ایک مایہ ناز بافیض شاگرد حضرت مولانا عبدالوہاب ویلوری بانی مدرسہ باقیات صالحات ویلور (متوفی ۱۳۳۷ھ) نے ازالۃ الشکوک کی کتابت و طباعت وغیرہ کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس کی کتابت و تصحیح میں لگ گئے، ازالۃ الشکوک جلد دوم کے اخیر میں تحریر ہے "تصحیح اس دوسری جلد کی مع جلد اول ازالۃ الشکوک کے فقیر عبدالوہاب نے شعبان المعظم ۱۲۸۷ھ میں تمام کیا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ میں ازالۃ الشکوک کی تصنیف مکمل ہوئی اور اس کے سترہ سال بعد حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب اس کی کتابت کی تصحیح سے فارغ ہوئے، اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی کتاب طباعت و اشاعت کے مراحل سے نہ گزر سکی بلکہ اسے طویل صبر آزما انتظار کرنا پڑا، چنانچہ جلد اول کے داخلی ٹائٹل پیج پر سن اشاعت ۱۳۲۶ھ لکھا ہوا ہے، جلد دوم پر سن اشاعت درج نہیں ہے لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ جلد دوم کی اشاعت حضرت مولانا عبدالوہاب ویلوری کی وفات کے بعد ہوئی، کیوں کہ جلد دوم کے ٹائٹل پیج پر لکھا ہوا ہے "حسب فرمان جناب حضرت مولانا مولوی الحاج ابوالفضل ضیاء الدین محمد صاحب مدظلہ العالی"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کتابت و تصحیح کے بعد ازالۃ الشکوک کی جلد اول کو اشاعت کے لیے طویل مدت تک محفوظ رہنا اور قابل اشاعت باقی رہنا خود کسی کرامت سے کم نہیں"۔(۲۶)

اس طویل اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مدرسہ کے قیام اور ترقی و ترویج کے

مسائل و معاملات نے حضرات مصنف و مصحح کو ''ازالۃ الشکوک'' کی فوری طباعت و اشاعت سے روکے رکھا، شاہ عبدالوہاب کی تحریر میں ''تصحیح'' سے مراد کتابت کے بعد کاتب سے ہونے والی بھول چوک کی تصحیح نہیں ہے، بلکہ راقم الحروف کی رائے میں مصنف کے مسودہ کو مبیضہ میں تبدیل کرتے ہوئے جس طرح کی کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے، اس عمل کو لفظ تصحیح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری علوم عقلیہ ونقلیہ کے باکمال عالم تھے، ہندوستان میں ان کے اساتذۂ کرام میں علامہ حکیم شاہ زین العابدین ویلوری (متوفی ۱۲۹۷ھ)، مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ)، استاذ العلما مولانا غلام قادر مدراسی (متوفی ۱۲۹۳ھ) مشہور ہیں، مکہ مکرمہ میں جن محدثین وفقہا سے استفادہ کیا، ان میں مولانا سید محمد حسین محدث نیشاپوری نزیل مکہ، مفتی حرم شریف علامہ شیخ احمد دحلان شافعی، محدث ملا محمد نواب ہندی وغیرہ قابل ذکر ہیں جیسا کہ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی لکھنوی (متوفی ۱۹۲۳ء) کا بیان ہے:

''ثم سافر الی مکۃ المکرمہ واخذ عن الشیخ رحمۃ اللہ ابن خلیل العثمانی الکیرانوی والعلامہ ملا محمد نواب الھندی المھاجرین الیٰ مکۃ واخذ الحدیث عن الشیخ احمد دحلان الشافعی مدرس الحرم الشریف والسید حسین المھاجر''(۲۷)

شاہ عبدالوہاب نے چونکہ تصوف وسلوک کا درس حضرت قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ)، حضرت امداداللہ مہاجر مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ) اور مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی (متوفی ۱۳۱۳ھ) جیسے صوفیہ حضرات سے حاصل کیا تھا اور اجازت وخلافت سے بہرہ ور ہوئے تھے، اس لیے ان کے مزاج میں حد درجہ خاکساری وفروتنی اور تواضع وانکسار پایا جاتا تھا، عیسائی علما اور مسیحی مبلغین کو غالباً ان کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا، اس لیے عین ممکن ہے کہ انھوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر بحث ومباحثہ کرنے کی جرأت کی ہو، نتیجے میں انہیں شکست فاش اٹھانی پڑی۔ اس امکان کی وجہ ان مبلغین کی جانب سے مدراس میں کی جانے والی شرارتیں اور ہر مشہور شخصیت سے بحث کرنے کی ان کی خواہش ہے جس کا کچھ حصہ قاضی بدرالدولہ کے تذکرے میں گزر چکا ہے، الغرض ایک دوبار اس کا تلخ تجربہ ہونے کے بعد عیسائی مشنریوں نے اپنی سرگرمیوں کو شہر ویلور سے دور جنوب کے ساحلی

علاقوں مثلاً منگلور، کالی کٹ، کوچین، کنیا کماری وغیرہ شہروں میں پھیلایا مگر وہاں بھی شاہ عبدالوہاب کے شاگردوں نے ان کا دائرہ تنگ کر دیا تو ان پادریوں نے اپنا دائرۂ کار دلتوں اور پچھڑی ذاتوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں تک محدود کر لیا، اس طرح عیسائیت کا زور انگریزی حکومت کے باوجود جنوبی ہند میں قائم نہ رہ سکا۔ جس کا بین ثبوت ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود مذکورہ شہروں میں مسلمانوں کے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنے اور عیسائی مشنریوں کے مسلمانوں کی آبادی سے دور رہنے کے منظرنامے میں پایا جاتا ہے۔

شاہ عبدالوہاب قادری کے اکلوتے فرزند خان بہادر ابوالفضل ضیاء الدین محمد اپنے والد اور استاذ علامہ رحمت اللہ کیرانوی کی طرح ردعیسائیت کے مسئلے میں بڑے حساس اور بہت فعال تھے، ان بزرگوں کی تعلیم وتربیت نے ان کو عیسائی مشنریوں کے خلاف صف آرا ہونے اور عملی قدم اٹھانے پر آمادہ کیا تھا، چنانچہ انہوں نے بانی باقیات علیہ الرحمہ کے قول ''اشاعت اسلام سے پہلے حفاظت اسلام کی فکر کرنی چاہیے'' کو ذہن میں رکھ کر بانی باقیات کے انتقال کے دوسرے سال ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق فروری ۱۹۳۰ء میں ''حفاظت الاسلام'' کے نام سے ٹمل زبان میں ایک ماہنامہ شہر مدراس سے اپنی سرپرستی میں جاری کیا جس کے اولین مدیر مولانا محمد علی باقوی اور نائب مدیر مولانا ایس ایس عبدالقادر باقوی اتم پالیمی مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ اس کے ابتدائی شمارے راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں (۲۸)۔ علاوہ ازیں ضیاء الدین محمد نے ''حفظ العلماء'' کے عنوان سے ایک مجلس قائم کی جس میں ستر علمائے کرام بحیثیت ارکان شریک تھے، ان میں فارغین مدرسۂ باقیات (باقوی) کی کثرت تھی، اسی مجلس کے تحت ایک ذیلی کمیٹی بنام ''اصلاح العقائد'' کی بنیاد رکھی گئی جس کے ذمہ جنوب کے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں آباد مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کا کام تھا۔ ''اصلاح العقائد'' کے اہل قلم علما وقتاً فوقتاً ''سیف العقائد'' کے سرنامے کے تحت رسائل لکھ کر تعلیم یافتہ افراد میں تقسیم بھی کرتے رہتے تھے۔

ردّ عیسائیت کی اس تحریک میں علامہ ضیاء الدین محمد کے ایک نامور شاگرد مولانا ابوالحسن شاذلی باقوی (ولادت ۱۹۱۹ء وفات ۱۹۹۸ء) ابن مولانا محمد عبدالقادر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، حضرت شاذلی کے ہمراہ ان کے بھائی مولانا محمد عبدالرحمن باقوی (مفسر انوار القرآن، ٹمل) بھی اس

تحریک کا حصہ بنے ہوئے تھے، مولانا شاذلی نے ردّ عیسائیت میں متعدد کتابیں تحریر کی تھیں، ان میں ''قرآن اور بائبل کا تقابلی مطالعہ، کیا حضرت عیسیٰ خدا کے فرزند ہیں؟، اور اسلام کیا ہے'' بہت مقبول و مشہور ہوئیں۔ مولانا شاذلی کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ عیسائیوں کے چرچوں اور عبادت گاہوں میں پہنچ کر پادریوں اور مسیحی علما سے مناظرے کرتے اور انہیں حلقہ بگوش اسلام کرتے تھے، ان تمام مناظروں کی تفصیل کتابچوں کی شکل میں شائع کی جاتی تھیں جو آج بھی ٹمل ناڈو کے کتب خانوں کی زینت ہیں، مولانا شاذلی اور ان کے بھائی ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے بھی سرگرم کارکن تھے، ۲۵/جنوری ۱۹۴۵ء کو ضلع ''ترناویلی'' کے شہر پیٹائی (Petai) میں مسلم لیگ کے رہنما نواب زادہ لیاقت علی خاں کو دعوت دے کر ان کے اعزاز میں عظیم الشان جلسہ کا انعقاد کیا تھا، مولانا شاذلی کو ملک کی آزادی کے بعد ''مسلم نیشنل گاڈس'' میں شرکت کی وجہ سے ۹۴ دن تک قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں، آخر کار ۳/مئی ۱۹۴۸ء کو ان کی رہائی عمل میں آئی، انہوں نے ۲۳/جنوری ۱۹۷۵ء کو شہر مدراس (چنائی) کے مشہور چرچ ''شانتوم'' میں ''اسلام میں نبوت'' کے عنوان پر مدلل و موثر تقریر کی جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر قادر محی الدین (سابق ایم پی) صدر مسلم لیگ، ٹمل ناڈو نے کیا، مزید برآں پالیم کوٹائی (ضلع ترنل ویلی) میں آپ کو ''کریچن ٹیچر ٹریننگ اسکول'' کی جانب سے بتاریخ ۲۳/نومبر ۱۹۹۰ء بعنوان ''قرآن مجید میں عیسیٰ علیہ السلام'' تقریر کی دعوت دی گئی، یہ طویل تقریر بھی چھپ کر مقبول ہوئی، مولانا شاذلی نے مسلم لیگ سے علاحدہ ہونے کے بعد ''جماعت العلماء'' کے نام سے ایک ماہنامہ ۱۹۷۲ء میں جاری کیا تھا جس کی ادارت کے فرائض انہوں نے اپنی وفات (۱۹۹۸ء) تک بڑی کامیابی کے ساتھ ادا کیے، بعد ازاں ان کے فرزند مولانا محمد ابراہیم باقوی نے اس شاندار مجلّے کو قدیم نہج پر باقی رکھا، الحمدللہ تا حال یہ ماہنامہ اسی آب و تاب کے ساتھ خاندان کے افراد کی سرپرستی میں شائع ہورہا ہے۔ اس مجلہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ''ردّ عیسائیت'' اور ''ردّ قادیانیت'' پر تحریر کردہ مضامین پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ حضرت شاذلی نے ''انجمن اشاعت الاسلام جنوبی ہند'' کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی تھی جس کے تحت تقریر و تحریر کے ذریعہ برادران وطن میں دین و ایمان کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ انہوں نے ۱۶/فروری ۱۹۸۱ء کو ''میناکشی پورم'' (رحمت نگر) میں تقریر کی جس کے اثر سے تقریباً آٹھ سو افراد مشرف بہ اسلام ہوئے یہ ادارہ ان کی رحلت

۲۷/شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۷/دسمبر ۱۹۹۸ء تک فعال رہا۔(۲۹)

ہندوستان میں مسلمانوں کی اولین آبادیوں میں سے ایک شہر ''کایل پٹنم'' (قاہرہ پٹن) علما و صوفیہ کا مرکز رہا ہے۔ تقریباً چالیس ہزار نفوس پر مشتمل صوبہ ٹمل ناڈو کا یہ شہر خلیج بنگال کے ساحل پر آباد ہے، اس کی قدامت کے لیے اس قدر جاننا کافی ہے کہ یہاں شیخ محمد خلجی کی ۲۲۸ھ مطابق ۸۴۲ء میں تعمیر کردہ مسجد اور اس کا سنگین کتبہ آج بھی موجود ہیں، راقم الحروف نے اس کی زیارت کی سعادت حاصل کی ہے، صدفی صد مسلم آبادی والے اس شہر میں تقریباً ستر (۷۰) مسجدیں ہیں، کہیں بھی سینما گھر اور پولیس اسٹیشن نہیں ہے۔ کام کاج کے لیے غیر مسلم افراد اطراف کے قریوں سے صبح سویرے یہاں آ کر شام اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں، یہ روایت صدیوں پرانی ہے، ''کایل پٹنم'' عرب تہذیب کا گہوارہ ہے، صدیوں پیشتر خلیفہ معتصم باللہ (متوفی ۲۲۷ھ) ابن خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں مصر کے باشندوں میں سے بعض خاندان خلیفہ اور اس کے گورنر کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کرتے ہوئے ہندوستانی ساحل ''معبر'' پر فروکش ہوئے، یہی وجہ ہے کہ اس آبادی کا نام ''قاہرہ پٹن'' رکھا گیا جو مرور زمانہ کے ساتھ ''کایل پٹنم'' میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں کے قدیم دارالعلوم ''جامعہ الزاویۃ الشاذلیہ'' (قائم شدہ ۱۲۸۵ھ) کے مہتمم مولانا مفتی عبدالقادر قاہری (ولادت ۱۹۱۲ء وفات ۱۹۶۵ء) کو بائبل مکمل یاد تھی، انہوں نے اس پر تحقیق کر کے اس علاقے کے مسیحی علما سے مناظرے کیے اور انہیں اپنی تبلیغ چھوڑنے پر مجبور کیا، مولانا قاہری نے علامہ رحمت اللہ کیرانوی ''ازالۃ الشکوک'' اور ''اظہار الحق'' سے خوب استفادہ کیا، بقول مصنف تاریخ کائل پٹنم (انگریزی) ڈاکٹر عبداللطیف (تلمیذ مولانا عبدالقادر قاہری) ''آپ کی حیات تک کائل پٹنم اور اطراف واکناف میں کسی چرچ کی تعمیر نہ ہو سکی اور روم کے پوپ پال کے گزٹ میں تحریر ہے کہ مولانا عبدالقادر کے رہنے تک وہاں عیسائیت کی اشاعت نہ ہو سکے گی، علاوہ ازیں ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ ان کے یہاں اٹالی سے مولانا قاہری کی شخصیت اور کارناموں کی تحقیق کے سلسلہ میں دو اسکالرس کایل پٹنم آئے تھے (۳۰) اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیرون ہند عیسائی مراکز میں بھی مولانا قاہری بائبل کے عالم اور بلند پایہ مناظر کی حیثیت سے مشہور تھے۔

ردّ عیسائیت میں تیرھویں صدی ہجری کے اختتام پر جنوبی ہند کے مشہور شہر ''بنگلور'' نے بڑا

اہم کارنامہ انجام دیا ہے، بنگلور سے شائع ہونے والا دس روزہ اخبار ''منشور محمدیؐ'' نصف صدی سے زائد عرصے تک ردّ عیسائیت میں سرگرم عمل رہا، اس اخبار کے خریدار کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلے ہوئے تھے، ''منشور محمدیؐ'' میں صرف عیسائیت کے متعلق ہی مضامین شائع ہوتے تھے، اس اخبار کے مختلف اوقات میں کئی مدیر ہوئے لیکن اختلاف فکر و مسلک کے باوجود سب نے اخبار کے مقصد اصلی ہی کو پیش نظر رکھا۔ لکھنؤ سے پادری مسمور کی سرپرستی میں شائع ہونے والے رسالے ''شمس الاخبار'' کے اعتراضات و اشکالات کے مدلل و مسکت جوابات ''منشور محمدیؐ'' میں ہوتے رہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر مسیحی علما کے اعتراضات کا تسلی و تشفی بخش جواب دینے کی ذمہ داری بنگلور کے اس جرات مند و بےباک اخبار نے لے رکھی تھی۔ ''منشور محمدیؐ'' کے لکھنے والوں میں ہر مکتب فکر اور ہر مسلک کے علما شامل تھے۔

''منشور محمدیؐ'' کے مالک و اولین مدیر ریاست میسور (موجودہ صوبہ کرناٹک) کے مشہور و معروف صحافی و شاعر حضرت مولانا منشی محمد قاسم غمؔ و شادؔ بنگلوری (متوفی ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء) ابن غلام حسین بن محمد ابراہیم تھے، جنہوں نے ماہ محرم ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں ریاست میسور کا اولین اردو اخبار ہفت روزہ ''قاسم الاخبار'' جاری کیا تھا، یہ اخبار حضرت غمؔ کی وفات تک مکمل بتیس (۳۲) سال شائع ہوتا رہا، بڑی تقطیع کے آٹھ صفحات کے اس رسالہ کی سالانہ خریداری نو (۹) روپئے تھی۔ (۳۱) مولانا غمؔ جو بعض اوقات شادؔ تخلص بھی اختیار کرتے تھے، ایک قادر الکلام شاعر تھے، ان کو نواب میر اکبر علی خاں جذبؔ جیسے ماہر فن سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ (۳۳)

انہوں نے اپنے صرف خاص سے دہ روزہ ''منشور محمدیؐ'' جاری فرمایا، اس کا پہلا شمارہ ۲۰/ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۵/ اگست ۱۸۷۲ء کو سولہ صفحات پر اور دوسرا شمارہ یکم رجب المرجب ۱۲۸۹ھ کو بارہ صفحات پر ''قاسم الاخبار'' کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوا۔ بعد ازاں ''منشور محمدیؐ'' ۱۰/ رجب المرجب سے بارہ صفحات پر ہر ماہ تین مرتبہ باقاعدہ مسلسل چھپنے لگا، اس کے سرورق پر بانی یا مدیر کے نام کے بجائے یہ اشعار رہتے ؎

''منشور رسولاں ہمہ محتاج بہ خاتم　　با خاتم و مہر آمدہ منشور محمدؐ
توریت بلا توریہ، انجیل بہ تسجیل　　گویاں صفت و سیرت مبرور محمدؐ''

جلد ایک شمارہ نمبر ۳ مورخہ ۱۱؍رجب ۱۲۸۹ھ میں اخبار کے اجراء کی غرض وغایت کے لیے یہ اشعار تھے ؎

"احساں ہے خدائے دو جہاں کا ۔ "منشور محمدؐ" ہے نکلا
ہے اک یہ صحیفۂ کرامت ۔ درج اس میں ہے ہر طرح ہدایت
شمس الاخبار لکھنو سے ۔ کچھ کھلتے ہیں مذہبی شگوفے
بے اصل ہیں بے بہار ہیں سب ۔ وے راہ خدا کے خار ہیں سب
وہ شمس ہے جن کا نام اونکا ۔ مسمور ہے پادریٔ والا
"منشور" جب ہے نور افزا ۔ اس شمس کو بس زوال ہوگا
کیا کہتے ہیں اب جناب مسمور ۔ چلتا ہے کہیں بھی مور کا زور
انجیل کی باتیں ہیں اس میں ۔ توریت کی آیتیں ہیں اس میں
استاد صحف کی اس میں آئیں ۔ بروجہ صحیح میں نے لائیں
ایزدی سے سب کی ہے یہ مقصود ۔ عیسائی خدائی ہووے نابود" (۳۴)

اسی طرح جلد دو شمارہ گیارہ ۱۱؍ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ میں تحریر کردہ مثنوی کے اشعار "منشور محمدیؐ" کی ضرورت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

"بعد حمد خالق و نعت رسول ۔ کھلتے تقریر موحد کے ہیں پھول
لکھنو سے اک شگوفہ جور کا ۔ یعنی پرچہ پادری مسمور کا
نکلے ہیں دو مرتبہ ہر ماہ میں ۔ خار کی مانند حق کی راہ میں
نام رکھا شمس ہے اخبار کا ۔ نور پر گرتا ہے شعلہ نار کا
تہمت عیسیٰ کی منادی پر لگا ۔ کرتے ہیں توہین فخر انبیاؐ
افترا، بہتان والزام قبیح ۔ سرور عالمؐ پہ دھرتے ہیں صریح
اور خصوصاً ہیں جو کالے پادری ۔ تازہ نخوت جن کے سر میں ہے بھری
سوقیوں کی طرح سے بے نام وننگ ۔ جوہر ذاتی کے دکھلاتے ہیں رنگ
دین حق پر اپنے ہیں ہم استوار ۔ ہیں دل و جاں سے محمدؐ پر نثار

داغ ظلمت ہے یاں نام خدا نور منشور محمد مصطفی

سید الکونین .... مرسلیں آخر آمد بود فخر الاولیں''(۳۵)

''منشور محمدیؐ'' کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے کہ اس نے کرناٹک کے شعرا و ادبا کو شمالی ہند کے علمی و ادبی طبقے میں متعارف ہونے کا زریں موقع فراہم کیا۔ اس کے مضمون نگاروں میں مشہور مناظر مولانا محمد ابوالمنصور، مولانا چراغ علی، مولانا سید عبدالحی سبزواری، مولانا محمد علی کانپوری، مصنف ''دفع التلبیسات'' مولانا حافظ ولی اللہ، مولانا محمد رکن الدین، مولانا مرزا موحد، سراج العلماء سید نصرت علی قیصر، مولانا فدا علی عیش مدیر ''روزنامچہ لکھنو'' مولانا محمد مکمل، مولانا فقیر محمد لاہوری وغیرہ اہل علم و فضل قابل ذکر ہیں۔

''منشور محمدیؐ'' میں جن تحریروں پر مدلل جرح ہوئی، ان میں پادری عمادالدین امرتسری اور اس کی تالیف ''ہدایت المسلمین'' (جلد ۱، شمارہ نمبر ۹، صفحہ ۱۰)، منشی چمن لال عیسائی اور اس کی منظومات (جلد ۱، شمارہ ۱۳، صفحہ ۱۲)، امداد حسین بیمار عیسائی اور اس کے اشعار (جلد ۲، شمارہ ۱۸، صفحہ ۱۳)، پادری رجب علی اور اس کی تحریریں (جلد ۱، شمارہ ۶، صفحہ ۴) شامل ہیں۔ اس اخبار کے خریدار شمال و جنوب ہر جگہ تھے۔

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری کے مولف مولانا سید محمد الحسنی مرحوم نے تحریر کیا کہ ''۱۲۸۹ھ میں انھوں نے (مولانا مونگیری نے) اس مقصد (ردّ عیسائیت) کے لیے کانپور سے ایک اخبار جاری کیا اور اس میں عیسائیت کی تردید اور ان کے عقائد کے ابطال میں مضامین شائع کرنا شروع کیے، لیکن پادریوں نے اس میں سے کسی ایک مضمون کا جواب دینے کی جرات نہیں کی، مولانا اس اخبار کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب ''آئینۂ اسلام'' میں لکھتے ہیں:

> ''اخبار منشور محمدی میں اکثر مضامین چھپے ہیں، جن کو مشتہر ہوئے نو دس برس کا عرصہ ہوتا ہے مگر آج تک نہ تو منشی صفدر علی صاحب نے ان کے جواب الجواب میں قلم اٹھایا اور نہ کسی پادری نے''۔ (آئینۂ اسلام، ص ۱، حاشیہ)

اخبار ۴-۵ سال تک گرانقدر خدمات انجام دینے کے بعد بند ہوگیا، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد علی، محدث زمانہ مولانا احمد علی کے ہاں تکمیل حدیث کے لیے گئے ہوئے تھے۔(۳۶)

قابل غور بات یہ ہے کہ جس سال بنگلور سے مولانا محمد قاسم غم نے ''منشور محمدیؐ'' کا اجرا کیا

اسی سال کانپور سے مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے اسی نام سے اور اسی مقصد کے تحت اخبار جاری کیا، دونوں مقامات پر اخبار کا نام ''منشور محمدی'' اور سال اشاعت ۱۲۸۹ھ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ بقول مولانا سید محمد مونگیری کا اخبار ان کی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے چار، پانچ سال جاری رہ کر بند ہو گیا اس کے برعکس بنگلور سے مولانا غمؔ کا جاری کردہ اخبار نصف صدی سے زائد عرصے تک جاری رہا۔ ''ازالۃ الشکوک'' کے محقق و مسہل مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی نے اپنے طویل مقدمے میں مولانا سید محمد الحسنی کے حوالے سے اس بات کو دہراتے ہوئے لکھا کہ ''۱۲۸۹ھ میں مولانا مونگیری نے اخبار ''منشور محمدی'' جاری کیا جس میں عیسائیت کی تردید اور اس کے عقائد کے ابطال میں مضامین شائع ہوتے تھے، چار پانچ سال تک یہ اخبار جاری رہا''۔ (۳۷)

بات یہ ہے کہ دونوں فاضلوں (مولانا حسنی اور مولانا بستوی) کو التباس ہوا، مولانا مونگیری نے تحریر فرمایا کہ ''اخبار منشور محمدیؐ میں اکثر مضامین چھپے ہیں، جن کو مشتہر ہوئے نو دس برس کا عرصہ ہوتا ہے'' اس جملہ کا واضح مطلب یہی ہے کہ منشور محمدی تقریباً دس سال سے شائع ہو رہا ہے پھر یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ''یہ اخبار چار پانچ سال گرانقدر خدمات انجام دینے کے بعد بند ہو گیا''۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''منشور محمدی'' مولانا مونگیری کا اخبار نہیں بلکہ دوسروں کا (مولانا غمؔ کا) اخبار ہے۔ یہ ممکن ہے مولانا مونگیری نے اسے پسند فرمایا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس اخبار کے چند نسخے منگوا کر اپنے احباب میں تقسیم کیا ہو، جس سے غلط فہمی ہوئی کہ اس اخبار کو مولانا نے خود جاری کیا تھا، راقم الحروف نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں مولانا مونگیری سے منسوب اخبار کو تلاش کیا مگر اسے موجود نہیں پایا البتہ ''منشور محمدیؐ'' کی فائلیں بنگلور کی صد سالہ قدیم ''مسلم لائبریری'' (قائم شدہ ۱۹۱۲ء) کی زینت ہیں، (۳۸) بہر حال منشور محمدیؐ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں نہ صرف ''شمس الاخبار'' کا رد ہوتا بلکہ لدھیانہ کی مشنری کے آرگن ''نور افشاں'' اور اس جیسے اور رسالوں کے اعتراضات کا بھی جواب دیا جاتا، اس کی زبان پاک وصاف اور تحریر کا اسلوب شائستہ رہتا تھا۔ مثال کے طور پر:

قال: اگر اس بات میں کوئی عیب ونقصان نہ ہوتا اور زینبؓ کا نکاح کسی طرح اس زمانے کی عادت وآداب وحیا کے برخلاف نہ سمجھا جاتا تو اس کے حلال ہونے کی اک ایسی آیت کے ورود اور ایسی ایک اذن مخصوص کی کیوں ضرورت پڑی۔ انتہیٰ

اقول: ایام جاہلیت کے عرب کی نظر میں ایسا نکاح بے شک قبیح تھا اور اس کو ہم تسلیم کرتے ہیں، اس امر سے کیا حاصل، کیونکہ اس تقریر سے بنائے اعتراض نہیں کھلتی، آیا پادری صاحب کو رسوم جاہلیت کی حمایت سے صرف اس بات پر اعتراض ہے کہ یہ نکاح رسوم جاہلیت کے خلاف ہوا، اگر یہی اعتراض ہے تو کوئی دینداری کی بات نہیں۔ جاہلیت کی اس رسم کا منشا محض ایک وہم باطل اور عقیدہ خلاف حق تھا اور نہ شریعت موسوی میں اس کی حرمت تھی، ایسی رسم کی رعایت ٹھیک ٹھیک قاعدہ قدرت اور رسم فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ ایک شخص جو ایک مرد کا پسر صلبی نہیں ہے اس کو خلاف واقع ایسا قرار دے کے پسر صلبی کے احکام اس پر قائم اور مرتب کرتے ہیں، یہ رسم صریح عادت الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ پسر صلبی وہی ہوسکتا ہے جو عادتاً شخص منسوب الیہ کی صلب سے پیدا ہوا ہو، اسی حقیقت پر کلام مجید میں اشارہ ہوا ہے ''ماجعل ادعیاء کم ابناء کم۔ ذلك قولکم بافواھکم'' ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے کہ پادری صاحب اس کو اذن مخصوص ہی کیوں کہتے ہیں؟ یہ ان کی نافہمی ہے۔ یہ اباحت عام ہے ''لکیلا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیاءھم'' الخ۔(۳۹)

''منشور محمدیؐ'' کے نام پر سرسید احمد خاں (متوفی ۱۳۱۸ھ) کو اعتراض تھا، انہوں نے لکھا:

> ''یہی خیالات ہیں جن کے سبب لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن سے ہمارا دل تو کانپ جاتا ہے۔ ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) ''منشور محمدیؐ'' رکھا جاتا ہے، کیوں اس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اس کا قلم ٹوٹ نہ گیا جو اس نے ان لفظوں کو لکھا..........۔''(۴۰)

یہ اخبار مولانا غم کے انتقال کے بعد مختلف سرپرستوں کے زیر سایہ جاری رہا۔ محمد شریف اور ان کے صاحبزادوں نے اسے سنبھالے رکھا، کبھی کبھی کسی مالی دشواری کی وجہ سے اشاعت میں توقف بھی ہوا لیکن یہ رسالہ اپنے مقصد سے کبھی غافل نہ رہا۔(۴۱) تفصیل اور بھی ہے لیکن مذکورہ بالا جائزہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''ردّ عیسائیت'' میں علمائے جنوب نے اپنی حکمت عملی اور خداداد بصیرت کی روشنی میں حکومت وقت سے مقابلہ آرائی کے بغیر انگریز مشنریوں، پادریوں اور عیسائی مبلغین سے بے باکانہ مقابلہ کیا جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

مآخذ وحواشی

(۱) میر محمود حسین پروفیسر، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ''بغاوت ویلور'' مطبوعہ روزنامہ ''سالار'' بنگلور مورخہ ۲۸رفروری ۱۹۸۶ء، یکم مارچ اور ۳رمارچ ۸۹ء۔(۲) ویلور شہر میں حکومت کی سرپرستی میں ہر سال ۱۰رجولائی کو یوم بغاوت (Spoys mutiny) منایا جاتا ہے۔(۳) راہی فدائی ڈاکٹر، ''شواہد'' الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد مطبوعہ ۲۰۱۷ء ص ۱۹۵۔(۴) غیر مطبوعہ مکتوب، مخزونۂ کتب خانہ دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور (ٹمل ناڈو)۔ (۵) اسیر ادروی مولانا، مجاہد اسلام مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بحوالہ خطبات گارساں دی تاسی حصہ دوم ص ۲۰۱، ص ۲۰۲ فرید انٹر پرائزس، مطبوعہ ۲۰۰۴ ص ۵۴۔(۶) ایضاً ص ۵۶۔(۷) یوسف کوکن عمری مولانا، خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (جلد اول) مطبوعہ دارالتصنیف، مدراس ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء ص ۱۲۹۔(۸) ایضاً ص ۱۳۵۔(۹) عتیق احمد قاسمی بستوی مولانا، تحقیق وتسہیل ازالۃ الشکوک (جلد اول) تصنیف علامہ رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی، مکتبہ معہد الشریعہ لکھنو مطبوعہ ۲۰۱۵ ص ۱۴۸ تا ۱۵۵۔(۱۰) خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (جلداول) ص ۳۴۷ تا ۳۵۰۔

محمد ہادی اور گڈون کے درمیان جاری شدہ بحث ومباحثہ کی تفصیل قاضی بدرالدولہ نے ۷۴ صفحات پر مشتمل رسالے میں جمع کی تھی، یہ بے نام رسالہ اسی زمانے میں شائع بھی ہوا، اس بات کی اطلاع یوسف کوکن صاحب نے اپنی کتاب ''خانوادۂ قاضی بدرالدولہ'' کے حاشیے میں دی ہے، ص ۳۵۰۔

(۱۱) ایضاً، ص ۳۴۱۔۳۴۲۔(۱۲) ایضاً ص ۳۳۳۔۳۴۶۔(۱۳) ایضاً ص ۳۵۳۔(۱۴) محمد ولی اللہ قادری مولانا، جواہر العرفان، مطبع مجاریہ، حیدرآباد، دکن مطبوعہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء ص ۱۔(۱۵) راہی فدائی ڈاکٹر، ''شواہد'' الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد مطبوعہ ۲۰۱۷ء ص ۹۰۔۹۱۔(۱۶) عبدالحی شاہ احقر بنگلوری ''مثنوی مطلع النور'' مطبع محمدی معسکر، بنگلور، مطبوعہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء، ص ۲۱۔(۱۷) عبدالحی سید حکیم مولانا لکھنوی ''نزہۃ الخواطر'' مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۵۹ء، ص ۳۱۷۔(۱۸) سالنامہ اللطیف، دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور مطبوعہ ۱۳۸۹ھ ص ۱۳۶۔(۱۹) بشیر الحق قریشی ڈاکٹر، مکتوبات حضرت قطب ویلور، دارالتصنیف والاشاعت، حضرت مکان ویلور، مطبوعہ ۲۰۱۲ء، ص ۵۸۔۵۹۔(۲۰) ایضاً، ص ۶۸۔۶۹۔(۲۱) راہی فدائی ڈاکٹر، مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے علمی وادبی کارنامے، ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، مدراس۔ ۲، مطبوعہ ۱۹۹۶ء، ص ۸، ۹۔ (۲۲) عتیق احمد قاسمی بستوی مولانا، ازالۃ الشکوک، جلد اول ص ۵۸۔(۲۳) ایضاً، ص ۱۷۸۔(۲۴) راہی فدائی ڈاکٹر، خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۱۶ء، ص ۲۱۵۔(۲۵) راہی فدائی ڈاکٹر، علامہ حکمیؔ بنگلوری اور ان کی تصنیف ''دستور نامۂ فارسی'' ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، یوپی، شمارہ اپریل ۲۰۱۹ء،

ص ۲۷۲۔(۲۶) ''ازالۃ الشکوک'' مقدمہ ص ۸۷۱-۹۷۱۔(۲۷) ''نزہۃ الخواطر'' جلد ۸، مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۵۹ء، ص ۳۱۷۔(۲۸) ''حفاظت الاسلام'' کے اولین شمارے کی فوٹو کاپی راقم کے پاس محفوظ ہے، مولانا محمد سلطان باقوی قاہری نے مہیا کی تھی۔(۲۹) یہ تمام تفصیلات عزیز القدر مولانا محمد سلطان باقوی کی دی ہوئی ہیں جس کے لیے راقم مولانائے موصوف کا شکر گزار ہے۔(۳۰) عبداللطیف ڈاکٹر، تاریخ کائل پٹنم انگریزی (The Concise History of Kayal Patnam) شمس الدین ابا پبلی کیشنز، کائل پٹنم، ترونل ویلی ڈسٹک، ٹمل ناڈو، مطبوعہ ۲۰۰۴ء۔(۳۱) محمد سعید عبدالخالق، میسور میں اردو، مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس، مغل پورہ، حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ ص ۷۷-۸۰۔(۳۲) حبیب النساء بیگم ولی اللہ ڈاکٹر، ''ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما'' مطبوعہ برقی اردو پریس، بنگلور ۱۹۶۲ء، ص ۱۸۸-۲۴۱۔(۳۳) محمد خورشید عالم ندوی ''کرناٹک کی ادبی شخصیات'' مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷۔(۳۴) محمد قاسم غم منشی ''منشور محمدیؐ'' چا مراج پریس، معسکر، بنگلور، شمارہ نمبر ۳، ۱۱/ رجب ۱۲۸۹ھ ص ۱۔ (۳۵) ''منشور محمدیؐ'' جلد ۲، شمارہ ۱۱، ۱۹/ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ، ص ۱۔(۳۶) مولانا سید محمد الحسنی ''سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری'' مکتبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو، مطبوعہ اپریل ۱۹۶۴ء، ص ۴۸، ۴۹۔(۳۷) ''ازالۃ الشکوک'' مقدمہ، ص ۱۶۴۔(۳۸) بنگلور کے ''مسلم لائبریری'' میں جن مشاہیر کی آمد ہوئی تھی ان میں مولانا سید سلیمان ندوی (۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۵ء)، ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ (۹/ جنوری ۱۹۲۹ء)، مولانا ظفر علی خاں، مدیر زمیندار، لاہور (یکم ستمبر ۱۹۳۱ء)، نواب بہادر یار جنگ، حیدرآباد دکن (۲/ مارچ ۱۹۳۵ء)، جناب سید عبداللہ صاحب بریلوی، ایڈیٹر ''بمبئی کرانیکل'' (۳/ جون ۱۹۳۸ء)، شیخ محمد امین بار ایٹ لا، لاہور (۲۷/ اگست ۱۹۳۶ء)، بابائے اردو مولوی عبدالحق (۹/ مئی ۱۹۳۷ء)، جناب ساغرؔ نظامی (۳۰/ نومبر ۱۹۴۲ء)، شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی (۳۰/ نومبر ۱۹۴۲ء)، علامہ سیمابؔ اکبرآبادی، یاسؔ یگانہ چنگیزی، شیداؔ کشمیری، اعجازؔ صدیقی مدیر شاعر بمبئی (یہ سب ۲۴/ نومبر ۱۹۴۲ء)، جگرؔ مرادآبادی (یکم دسمبر ۱۹۴۲ء)، حفیظؔ جالندھری مصنف شاہ نامۂ اسلام (۲/ مئی ۱۹۴۳ء)، مولانا حفظ الرحمن، ناظم اعلیٰ جمعیت العلماء دہلی (۱۴/ جولائی ۱۹۵۴ء)، حضرت امجدؔ حیدرآبادی (۱۷/ نومبر ۱۹۵۹ء)، مولانا داؤد راز، ناظم جماعت اہل حدیث (۲۱/ فروری ۱۹۶۴ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔(۳۹) منشور محمدیؐ جلد ۲، شمارہ نمبر ۱۳، ۹/ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ روز شنبہ، ص ۹، ۱۰۔(۴۰) محمد سعید عبدالخالق، میسور میں اردو، مطبوعہ ۱۹۴۲ء، بحوالہ رسالہ اردو، بابت اپریل ۱۹۴۱ء، ص ۹۷۔(۴۱) جواب پر مشتمل رسالہ ابو حامد عبدالرحیم کے فرزند جناب ابو محمد عبدالواحد نے راقم الحروف کو دکھایا اور اس کا عکس لینے کی اجازت دی۔

علامہ شبلی کے نو دریافت خطوط

☆ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی کے یہ نو دریافت خطوط گھریلو اور ذاتی قسم کے ہیں جن سے بہت سے ذاتی حالات کی وضاحت ہوتی ہے۔اکثر و بیشتر خطوط سے حیات شبلی کے بعض گوشے اور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ متعدد تاریخوں کی بھی تعیین ہوتی ہے اور ان کے بیٹے حامد حسن نعمانی کی طالب علمانہ زندگی اور اس کے لیے علامہ شبلی کی فکرمندی سے آگاہی ہوتی ہے۔علامہ کی متعدد مصروفیات کا بھی علم ہوتا ہے اور خاص طور پر علی گڑھ سے علاحدگی کے فوراً بعد کی زندگی اور بعض دیگر واقعات سامنے آتے ہیں ان کی اہمیت کے لیے یہ سب کافی ہیں۔ہمارے لیے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ یہ علامہ شبلی کے قلم سے ہیں۔

ان خطوط کی تعداد ۳۶ ہے۔اس میں آدھا خط میر ولایت حسین، ۳/خط پروفیسر زماں مہدی، ۳/خط محمد اسحاق ایڈوکیٹ اور بقیہ انتیس خطوط حامد حسن نعمانی کے نام ہیں۔ یہ خطوط بغیر القاب و آداب کے لکھے گئے ہیں،صرف ایک خط میں حامد حسن کو ''عزیزی'' لکھا ہے،باقی تمام خطوط اس سے بھی خالی ہیں اور یہ تمام کے تمام پوسٹ کارڈ پر ہیں۔ذیل میں ان خطوط سے پہلے مکتوب الیہم کا بھی مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ میر ولایت حسین

میر ولایت حسین [۱۸۶۲۔۱۹۴۹ء] علامہ شبلی کے علی گڑھ کے دوستوں میں تھے، ریواڑی کے رہنے والے تھے۔وہیں ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں دہلی سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے اور فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ بی اے پاس کر کے یہیں ملازمت اختیار کر لی۔ سکنڈ ماسٹر پھر ہیڈ ماسٹر رہے۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ڈیوٹی شاپ کے بھی ذمہ دار رہے۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور علی گڑھ کے بعض دوسرے رسائل میں مضامین بھی لکھے۔ ۱۹۲۰ء میں ملازمت سے

☆رفیق اعزازی دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔azmi408@gmail.com

سبکدوش ہوئے، قیام علی گڑھ میں رہا۔ ۸ر جولائی ۱۹۴۹ء کو یہیں وفات پائی۔ انہوں نے آپ بیتی بھی لکھی ہے جس میں خود سے زیادہ ایم۔ اے۔ او کالج کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ اس میں علامہ شبلی کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ راقم کی کتاب ''شبلی خودنوشتوں میں'' میں علامہ شبلی کے حوالہ سے اس کا تجزیہ شامل ہے۔ [ص ۳۳۔۴۳]

علی گڑھ سے وحیدالدین سلیم [۱۸۶۹۔۱۹۲۸ء] نے جو ماہنامہ معارف جاری کیا تھا اس کے جاری کرنے کا اولاً منصوبہ علامہ شبلی اور میر ولایت حسین نے بنایا تھا مگر بوجوہ نہ نکال سکے۔

مئی ۱۸۹۸ء میں علامہ شبلی ایم اے او کالج علی گڑھ سے مستعفی ہوئے۔ چند سال پہلے ان کے اکلوتے فرزند حامد حسن نعمانی کالج میں داخل ہو چکے تھے۔ حامد حسن نعمانی کے نام علامہ شبلی نے جو خطوط اعظم گڑھ اور بعض دوسرے شہروں سے لکھے ہیں، بیشتر انہیں میر ولایت حسین کی معرفت لکھے گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حامد حسن نعمانی گویا ان کی سرپرستی میں تھے اور جب کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ میر صاحب ہی سے رجوع کرتے تھے۔ ان کے نام کا محض آدھ خط دریافت ہوا ہے:

> ''حامد کو غالباً آپ نے روپئے دے دیئے ہوں گے۔ وہ اب کہاں ہیں، اگر وہیں ہوں تو یہ کارڈ ان کو دکھا دیجئے گا۔
>
> روپئے تم کو میر ولایت حسین صاحب نے دے دیئے ہوں گے، مطلع کرو کہ تعطیل کب ہوگی اور تم کہاں جاؤ گے۔ لکھنو سے تم نے اپنے مصارف میں (پانچ روپئے) بوٹ کے لیے اور دس روپئے کپڑے کے لیے حساب میں لیا تھا۔ کیا اتنے دنوں میں بوٹ اور کپڑے پھٹ گئے۔''
>
> شبلی نعمانی
>
> ۱۳ر جون [۱۹۰۰ء] اعظم گڑھ

۲۔ پروفیسر زماں مہدی

یہ کون صاحب تھے معلوم نہ ہوسکا، غالباً وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ حامد حسن نعمانی کے متعدد خطوط ان کی معرفت بھیجے گئے ہیں، ان کے نام خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ حامد صاحب کے علی گڑھ میں ایک سرپرست یہ بھی تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں حامد صاحب کے مفرور ہونے پر جو خطوط لکھے گئے ہیں انہی کے نام ہیں۔ درج ذیل تین خطوط یہ ہیں:

[۱]

"آپ کا خط آیا۔ نہایت تسلی ہوئی۔

آپ کی توجہ سے اگر عزیز مذکور (۱) کسی کام [کے] قابل ہو گئے تو آپ میرے ساتھ وہ احسان کریں گے جو کبھی کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ والتسلیم

شبلی

الہ آباد۔ ۲/ مارچ ۱۹۰۰ء

---

[۲]

دربھنگہ تک حامد کا پتہ لگا۔ لیکن اب وہاں بھی نہیں ہے۔ آپ کو کچھ معلوم ہوا تو لکھئے۔ ہم لوگوں کا کھانا پینا چھوٹ گیا ہے۔ میری حالت موت سے بدتر ہے (۲) اس کے ساتھی صادق علی (۳) کا خاص وطن کہاں ہے۔ کچھ سہارا ملے تو میں خود جا کر ڈھونڈوں۔

خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔ ہمارے تمام خاندان میں حامد ہی صرف ایک لڑکا ہے،

(۴) آپ کے نام اس کا خط کس مضمون کا تھا۔ والسلام

شبلی، اعظم گڑھ

۱۶/ اپریل ۱۹۰۰ء

[پ، ن] ۱۰/ اپریل سے وہ دربھنگا سے بھی مفقود ہے۔

---

[۳]

"اقبال (۵) سے اتنا اور پوچھ کر اطلاع دو کہ سب سے پہلا خط جو میں نے ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ مجھ کو معلوم نہیں حامد کیوں ناراض ہیں اور مجھ کو ہر طرح ان کی خوشی منظور ہے۔ اس کے مضمون سے اقبال نے حامد کو مطلع کیا تھا یا نہیں اور کیا تھا تو کس تاریخ تک۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حامد نے انتظار کر کے جب دیکھا کہ کسی نے خبر نہ لی تو مایوس اور غضب ناک ہو کر کہیں نکل گیا۔"

شبلی

۲۱/ اپریل ۱۹۰۰ء

۳۔ محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الٰہ آباد

یہ علامہ شبلی کے منجھلے بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ گئے اور بی۔ اے کیا، پھر وکالت کا امتحان پاس کرکے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کا آغاز کیا اور شہرت و ناموری حاصل کی۔ جوانی میں ۱۲/اگست ۱۹۱۴ء کو یکا یک انتقال کیا۔ علامہ انہیں بہت عزیز رکھتے تھے، تمام گھریلو ذمہ داریاں انہیں کے سر تھیں۔ نیشنل اسکول کے ذمہ دار بھی یہی تھے، اس کی ترقی کے ساتھ وہ اعظم گڑھ کے تمام دیگر قصبات میں بھی نیشنل اسکول قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک رقم [پانچ سو روپئے] بھی مختص کرلی تھی۔ ان کی بے وقت موت سے علامہ شبلی کو سخت صدمہ پہنچا اور ان کا بڑا دلدوز مرثیہ لکھا۔ ان کے پوتے احمد اسحاق کے بقول وہ خود بھی اسی صدمے میں چل بسے۔

مکاتیب شبلی میں ان کے نام علامہ شبلی کے ۲۶/خطوط شامل ہیں۔ درج ذیل تین خطوط ان میں اضافہ ہیں۔

[ا]

"ہاں ڈاکٹر کی دوا سے کچھ فائدہ ہے۔ چانول تم سے بھیجتے نہ بنا۔ اپنا کام ہوتا تو پھر (؟) جگہ سے بندوبست کر لیتے۔ میرے لیے پانچ چھ روپئے کا بندوبست نہ ہوسکا۔ میرے نزدیک تو بہت ضرور ہے کہ تم تعطیل میں کھنڈا (۶) جا کر رہو، کیوں کہ میاں شبلی (۷) کے انتقال سے وہ گھر بالکل ویران ہوگیا، ایسے وقت میں لوگ دشمن کی دلدہی کرتے ہیں اور تمہاری تو بہر حال سسرال ہے، آگے تمہاری رائے، وہاں سے سمیع کے پاس آتے جاتے رہنا۔"

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ

۲۰/اپریل [۱۹۰۰ء]

---

[۲]

"طاعون کی کیا حالت ہے۔

کیا کتابوں کا ملنا ممکن نہیں۔

گرمی کی شدت سے مجھ کو وہاں آنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔

حامد کہاں ہیں۔کیا یہاں آ نہیں سکتے۔　　　　شبلی

۷/اپریل ۱۹۰۶ء

---

[۳]

میں مختار نامہ لکھ تو دوں ،لیکن کارروا ہی (؟) مجھ کو نہیں آتی ،ایک دن کے لیے ہی تم آجاتے تو بہتر تھا،کیا تم وہاں سیٹل ہو؟ تو کبھی میں وہاں آؤں،کیا کانفرنس میں نہ آؤ گے،اب کہ تو بڑی چہل پہل ہے۔آغاخان (۸) بھی آتے ہیں۔''　　　　شبلی

۲۴/دسمبر ۱۹۱۲ء

۴۔　　حامد حسن نعمانی:

علامہ شبلی کے اکلوتے فرزند ۱۸۸۰ء میں بندول میں پیدا ہوئے۔کچھ دن نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۲/نومبر ۱۸۹۹ء کو ایم۔اے۔او۔کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں ایف۔اے پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے تحصیلدار مقرر ہوئے۔ دیوگاؤں میں تقرر ہوا۔پھر جونپور اور ضلع بستی کی تحصیل ڈومریا گنج کے تحصیلدار رہے۔کچھ دن گورکھپور میں بھی تحصیلداری کے فرائض انجام دیے۔حسن کارکردگی کی وجہ سے میڈل ملے۔ پولو کھیلنے کے بڑے شوقین تھے۔گورکھپور میں ایک پولو گراؤنڈ ان سے منسوب تھا۔ایک مرتبہ بڑا انعام حاصل کیا۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی ندوہ سے وابستہ تھے۔ایک محفل میں کسی نے ان کے انعام حاصل کرنے کا فخریہ ذکر کیا تو علامہ شبلی نے کہا کہ یہ تعریف کسی نٹ کے بیٹے کی ہو سکتی ہے،شبلی کے بیٹے کی نہیں۔ [مولوی عبدالباری،سرگذشت ص ۱۵]

وہ عمر میں مولانا سید سلیمان ندوی سے دو تین سال بڑے تھے۔باوجود اس کے انہیں بھائی صاحب کہا کرتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔اعزہ واقربا کو دارالمصنّفین کے معاملات میں دخل دینے ،حتی کہ وہاں جانے سے بھی منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بھائی صاحب [سید صاحب] اس کے اصل وارث ہیں اور وہ ابا کی یادگار کو بہت ترقی دے رہے ہیں۔خود سید صاحب انہیں بہت

قریب رکھتے تھے۔ جب انہوں نے دفعتاً انتقال کیا تو سید صاحب نے معارف میں ان کا ماتم کیا۔

۲۰؍مارچ ۱۹۴۲ء کو جون پور میں جہاں وہ کسی ذاتی کام سے گئے تھے، وہیں انتقال ہوا۔ وہاں سے جنازہ اعظم گڑھ لایا گیا اور شبلی منزل میں والد ماجد کے پاس دفن کیے گئے۔

کیپٹن سہیل سلطان سے ان کے نام کے ۲۹؍غیر مطبوعہ خطوط ملے ہیں جو زیادہ تر علی گڑھ سے لکھے گئے ہیں۔ ان سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی کی کتاب الفاروق کے جلد ساز احسان علی تھے جو بالائے قلعہ رہتے تھے۔ علامہ شبلی نے فارسی کی جو نصابی کتابیں [انٹرنس کورس، ایف۔ اے اور بی۔ اے فارسی کورس فارسی] الہ آباد یونیورسٹی کے لیے تیار کی تھیں وہ ڈیوٹی شاپ جس کے ذمہ دار میر ولایت حسین تھے سے فروخت ہوتی تھیں۔ اس وقت علی گڑھ میں طلبہ کے اخراجات ۱۹؍روپئے تھے۔ جیب خرچ ۵؍روپیہ میں پورا ہو جاتا تھا۔

بعض خطوط پر تاریخ و سنہ نہیں ہے، ان کی تعیین پوسٹ کارڈ پر لگی مہروں سے کی گئی ہے اور انہیں بریکیٹ میں درج کیا گیا ہے۔

اب تک علامہ شبلی کے کل ۱۱۱۵ خطوط مدون و مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ گذشتہ دنوں دو اور خطوط معارف میں ڈاکٹر شمس بدایونی نے شائع کیے تھے۔ راقم نے ایک غیر مدون خط اپنے مضمون ''علامہ شبلی کی چند نادر تحریریں'' مطبوعہ معارف میں شامل کیا۔ ایک اور خط بنام قوس حمزہ پوری راقم کے مقالہ ''علامہ شبلی کی چند غیر مدون تحریریں'' مطبوعہ ماہنامہ معارف مارچ ۲۰۱۹ء میں آ گیا۔ اب ان نو دریافت ۳۶ خطوط سے علامہ شبلی کے تمام دریافت خطوط کی تعداد ۱۱۵۵ ہو گئی ہے۔

حامد حسن نعمانی کے نام مکاتیب شبلی میں ایک اور مکتوبات شبلی میں دو خطوط پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ نو دریافت ۲۹؍خطوط سے ان کے نام کے خطوط کی تعداد بتیس [۳۲] ہو گئی ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

[۱]

''کالج بند ہوگا۔ اب کتابوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تم نے حساب دے دیا ہے، کیا تم تعطیل میں بھی علی گڑھ رہو گے۔

کانپور میں ہفتہ سے زیادہ رہوں گا۔ تم مجھ سے ملتے جاؤ۔ انور گنج مکان ندوۃ العلما میرا

پتہ ہے۔"

شبلی

کان پور [۵/ اگست ۱۸۹۸ء]

---

[۲]

معلوم ہوتا ہے تم کو میرا جواب نہیں پہنچا۔

خیر اب فوراً کانپور محلہ انور گنج دفتر ندوۃ العلما میں آؤ۔ خرچ راہ کسی سے قرض لے لینا۔ یہاں سب ادا کرادیا جائے گا۔

شبلی نعمانی

۱۰/ اگست [۱۸۹۸ء] کان پور

---

[۳]

عزیزی

تم فوراً اپنے حالات صحت سے آگاہ کرو۔ علاج میں کتنے دن صرف ہوں گے۔ علی گڑھ سے تمہارا نام خارج ہوگیا ہے اور [بارہ روپئے] بقایا کے مجھ کو ادا کرنے پڑے ہیں۔

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ۔ ۴/ اکتوبر ۱۸۹۸ء

---

[۴]

عزیزی حامد

ایک دوست کا خط آیا کہ تم کو افاقہ نہیں ہوا یا بہت کم ہوا۔ اس لیے علاج کسی اور سے کرنا اچھا ہوگا۔ کیا یہ صحیح ہوگا۔ فوراً لکھو۔

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ۔ ۲۱/ اکتوبر ۱۸۹۸ء(۹)

---

[۵]

وہی حال ہے۔ اب ڈاکٹری علاج ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے خرچ تو البتہ سو روپیہ ماہوار بڑھ گیا ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

احسان علی (۱۰) نام جلد ساز بالائے قلعہ رہتا ہے۔اس کے پاس جا کر دریافت کرو کہ الفاروق کی جلدیں کیوں باندھ کر نہیں بھیجتا۔ ۳رمہینہ گذر چکا ہے۔

شبلی نعمانی

۴رمئی [۱۸۹۹ء]

---

[۶]

جیسا تم دیکھ کر گئے تھے، ویسا ہی ہوں۔اچھا ہو جاتا ہوں، پھر بیمار پڑ جاتا ہوں، احسان علی جلد ساز بالائے قلعہ شہر میں رہتے ہیں۔ان کے پاس الفاروق جلد بندھنے کے لیے گئی ہے، اب تک نہیں آئی، تم خود جا کر دیکھو کیا حال ہے۔تمہارا ماہوار خرچ بورڈنگ کا کیا ہے۔تعطیل میں تم کہاں رہو گے۔ تمہارے خسر صاحب نے انتقال کیا۔

شبلی نعمانی

۱۴رمئی [۱۸۹۹ء]

---

[۷]

جب تم اپریل میں نصف مہینہ بھی بورڈنگ میں نہیں رہے تو (بیس روپیہ) کیوں کر خرچ ہوا۔ بہر حال میں نے میر ولایت حسین صاحب کو لکھ دیا ہے، وہ ضروری خرچ تم کو دے دیں گے۔

تم جون پور میں سمیع (۱۱) کے پاس رہو اور پندرہ دن کھنڈا میں قیام کرو۔

شبلی

۳۱رمئی [۱۸۹۹ء]

---

[۸]

سوالات ذیل کا جواب لکھو۔

کس تاریخ کو کالج میں داخل ہوئے۔بورڈنگ و کالج کا اس وقت تک کس قدر مطالبہ ہوا۔ کس قدر ادا ہوا، اب کس قدر باقی ہے، تعطیل میں کہاں پر رہو گے۔وہاں سے خرچ ہر گز نہ لو۔

شبلی

اعظم گڑھ

[۲رجولائی ۱۸۹۹ء]

[۹]

علی گڑھ

تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، تم جو چاہو میں اس پر راضی ہوں۔ پڑھو یا نوکری کرو یا اور جو چاہو، صرف اس قدر ہے کہ میری تنخواہ سو روپیہ ہے اس لیے [۲۵/روپئے] سے زیادہ میں نہیں دے سکتا۔ بے شبہ وہ اتفاقی ہی خرچ تھے جو تم کو پیش آئے لیکن یہ امر بالکل قطعی اور یقینی ہے کہ ہمیشہ ایسے ہی اتفاقی خرچ پیش آتے رہیں گے کیوں کہ..................

بہتر تو یہ ہے کہ دو ایک روز کے لیے مجھ سے مل جاؤ۔ سامنے جو بھی رائے قائم ہو سکے گی کہ تم کو کیا کرنا چاہیے تم نے خود ہی لکھا کہ ہاں نوکری مناسب ہے۔ اب اس قدر بیزار ہو۔

شبلی، اعظم گڑھ

۲۶/جولائی [۱۸۹۹ء]

---

[۱۰]

خط پہنچا، حافظ ڈیوٹی (۱۲) کو میں کل خط لکھ دوں گا۔

کلکتہ جا کر جو تمہارا حرج ہوا کیا وہ کم ہے کہ تم کو پھر لاہور وغیرہ جانا چاہیے، کیا صرف کھیل کے لیے کالج میں رہنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ افسران کالج تم کو مجبور کرتے ہوں، اگر ایسا ہے تو فوراً لکھو کہ میں تم کو معاف کرادوں۔

بوٹ کی قیمت [۸ یا ۹/روپیہ] ہوئی۔ کوٹ تم نے نیا بنوایا تھا وہ کیا ہوا۔

میری یہ حالت ہے کہ جو کچھ روپیہ تھا وہ صرف ہو گیا۔ راستہ کا خرچ بھی نہیں کہ کہیں کا قصد کروں۔ تنخواہ کا انتظار ہے۔ ادھر اپنے سرکاری کاغذات چھپوا رہا ہوں، اس کی اجرت بالکل قرض پر ہے۔ اگر تم دورہ پر نہ جاؤ تو نہ تم کو کوٹ کی ضرورت ہے نہ کسی اور چیز کی۔ شبلی

الٰہ آباد۔ ۲۱/جنوری ۱۹۰۰ء

---

[۱۱]

تم نے لکھا تھا کہ میرکلن (۱۳) نے کچھ روپئے دینے کے لیے کہا ہے۔ ان کے پاس چھ روپئے

سے زیادہ تھے۔اس لیے [۵/روپیہ] جیب خرچ اس میں سے محسوب کرلو۔

کپڑوں کے لیے خرچ اس وقت بھیجوں گا،لیکن اگلے مہینہ کا خرچ میں مارچ سے پہلے نہیں بھیج سکتا۔یعنی جب تک تنخواہ نہ آجائے۔

میں مرزا پور گیا تھا اور بعض کام درپیش ہیں۔

میر ولایت حسین صاحب نے مطلق جواب نہیں دیا۔تم ضرور مل کر جواب لکھواؤ اور یہ تو تم بھی لکھ بھیجو کہ انٹرنس وایف۔اے کورس چھپ گیا یا نہیں۔

والسلام
شبلی

الٰہ آباد [غالباً فروری ۱۹۰۰ء]

---

[۱۲]

اقبال احمد کا وہ تنہا خرچ نہ تھا بلکہ مختار (۱۴) کا بھی تھا،تم دو کو ایک سمجھتے ہو۔

بلٹی اس قدر دیر میں آئی کہ ۱۷/روپیہ تاوان دے کر آج پتھر اتروایا گیا۔تمہارے خرچ کی بات یہ ہے کہ [۱۹/روپئے] کالج کے مصارف ہوں گے۔باقی [۵/روپیہ] جیب خرچ کے جایا کریں گے۔

مجھ کو بخار آتا ہے۔

شبلی

۱۳/اپریل [۱۹۰۰ء] اعظم گڑھ

---

[۱۳]

میاں علی احمد (۱۵) پر تمہارے ہاں کے نیل کے حساب میں [۲۰۰/روپئے] باقی ہیں جس میں سے انہوں نے بابو (۱۶) کے اور میری معرفت [۱۰۰/روپئے] دیا تھا۔سو باقی ہیں۔اس کی نسبت اب تقاضہ ہوا تو ان کے رجسٹر حساب میں لکھا ہے کہ سو روپیہ حامد کو دیئے گئے،کیا تم نے کبھی علی احمد مرحوم سے سو روپئے لیے۔

فوراً جواب لکھو۔

شبلی

اعظم گڑھ۔۱۶/جون [۱۹۰۰ء]

---

[۱۴]

میں یہاں تک آ گیا۔ دو ایک روز میں الہ آباد پہنچوں گا۔

تم سب پروفیسروں سے سرٹیفکٹ لے کر فوراً الہ آباد آو، وہیں سے سامان سفر ہو کر آگے بڑھیں گے۔ وہیں کپڑے بھی بنیں گے۔

البتہ اگر کوئی صورت ملازمت کی وہاں پیدا ہو رہی ہو تو ٹھہر جاؤ اور مجھ کو الہ آباد کے پتہ سے مطلع کرو۔

شبلی نعمانی

مرزاپور۔ ۱۶؍جون [۱۹۰۰ء]

---

[۱۵]

بہت پہلے تمہارے پاس روپئے بھیج دیئے گئے۔ پہنچے ہوں تو فوراً چلے آؤ۔ ورنہ اطلاع دو کہ میں دریافت کروں۔ والدعاء

شبلی نعمانی

یکم جولائی ۱۹۰۰ء، الہ آباد

---

[۱۶]

آج حکیم عبدالولی صاحب (۱۷) نے مفصل فرد حساب دواؤں کی بھیجی۔ وہ تمہارے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ علی گڑھ جاتے ہوئے جو تم نے علاج کیا اور مجھ سے قیمت منگوائی وہ بالکل ادا نہیں کی۔ افسوس اٹلی اگر گیا تو تم کو لے چلوں گا لیکن تیسرے درجہ میں۔

حامد!

بیماری کے زمانہ میں تم نے بڑے زور سے لکھا تھا کہ میں اپنا اعتبار ثابت کروں گا۔ کیا اس کا یہی طریقہ ہے۔

شبلی

۳۰؍جولائی [۱۹۰۰ء]

---

[۱۷]

فوراً ایک جلد بی۔ اے کورس و ایک جلد ایف۔ اے کورس ڈیوٹی سے میرے حساب میں

بنام مولوی محی الدین اسسٹنٹ پروفیسر میور کالج (۱۸) بھجوادو، بشرطیکہ یہ کتابیں بنام حکیم قنبر علی صاحب الٰہ آباد (۱۹) پہلے نہ جاچکی ہوں۔

شبلی۔اعظم گڑھ

۱؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

---

[۱۸]

خط پہنچا، تمہارے لکھنؤ نہ جانے سے والد قبلہ بلکہ تمام لوگوں کو رنج ہوا، ممکن تھا کہ تم وہاں قیام نہ کرتے، لیکن علی گڑھ جاتے ہوئے والد قبلہ کو دیکھتے جاتے تو ان کی خاطر داری ہو جاتی۔

یہاں سے مولوی سعید (۲۰) ماموں صاحب (۲۱) میاں عثمان (۲۲) والد کے دیکھنے کے لیے جارہے ہیں۔

میاں حمید (۲۳) کو اپنی نسبت خود کچھ معلوم نہیں، وہاں سے طلبی آئی تو کیوں نہ جائیں۔

ہاں مکان پر خوب پانی برسا، اب کچھ شکایت نہیں۔ [۳۵؍روپیہ] بھیج چکا ہوں۔ والدعاء

شبلی۔اعظم گڑھ

۴؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

---

[۱۹]

تحریر کرو کہ نواب محسن الملک (۲۴) کہاں ہیں اور ان کے استعفیٰ کا کیا فیصلہ ہوا۔

والدعاء

شبلی۔اعظم گڑھ

۱۸؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۰]

چودہ روپئے بھیجے جاتے ہیں۔ اچکن ولحاف کے لیے، توشک کا کام کمبل دے گا۔ افسوس ہے کہ تم کو مولوی صاحب کا اعتبار آیا کہ ان کی تجویز پر عرق کھچوانا چاہتے ہو۔ شبلی

اعظم گڑھ۔ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۱]

صد افسوس!

تمہارا باپ یتیم ہوگیا۔

والد نے ۱۲؍نومبر وقت صبح دنیا کو رخصت کیا۔(۲۵) والدعاء

شبلی۔ ۱۴؍نومبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۲]

فوراً امور ذیل سے مطلع کرو۔

۱۔انٹرنس کورس(۲۶) پار سال ڈیوٹی سے کس قدر فروخت ہوا۔

۲۔تقریباً ہر سال کس قدر جلدیں انٹرنس کورس کی فروخت ہوتی ہیں۔

۳۔ڈیوٹی میں کس قدر نسخے انٹرنس کورس کے موجود ہیں۔

یہ سب امور مہتمم ڈیوٹی سے دریافت کر کے لکھو۔ والدعاء

شبلی۔اعظم گڑھ

۳۰؍نومبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۳]

قرضہ کی رقومات [میں] دیر ہو رہی ہیں۔

والد قبلہ نے ۲۶؍ہزار قرضہ چھوڑا ہے۔

لکھنؤ کو کیا تم نے ڈیوٹی سے روپئے بھیجے ہیں اور انہوں نے قرضہ دیا جب کہ میرا روپیہ موجود تھا۔ماریسن صاحب برات کی تاریخ کو سمجھاتے ہیں۔(۲۷) شبلی

اعظم گڑھ۔[۳؍دسمبر ۱۹۰۰ء]

---

[۲۴]

میں نے ابتدا سے حساب نہیں پوچھا تھا،صرف یہ دریافت کر کے فوراً اطلاع دو کہ پار سال کس قدر نسخے انٹرنس کورس کے فروخت ہوئے۔

حیدرآباد سے اب تک روپئے نہیں آئے (۲۸) سخت تکلیف ہے، چھاؤنی (۲۹) کے تمام مصارف اب مجھ پر اوراسحاق پر ہیں۔ بالکل قرضہ سے کام چل رہاہے اور تنخواہ آئے بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ کلکٹر صاحب نے تم کو نہ دیکھا نہ بھالا۔ علم غیب پر کیوں کر لکھ دیں گے۔ اس کے علاوہ اب بی۔ اے بہ مشکل لیے جاتے ہیں۔ انٹرنس کا کیا حساب ہے۔ تاہم تم موجود ہوتے تو کہا بھی جاتا۔ یوں کون سا طریقہ ہے۔

شبلی

۹؍دسمبر [۱۹۰۰ء] جواب طلب

---

[۲۵]

ٹسٹ کے نمبر تمہارے پرنسپل صاحب نے میرے پاس بھیجے، حساب میں ۲ نمبر ملے ہیں۔ اس حالت میں بے فائدہ شریک امتحان ہوتے ہو اور فیل ہونے کی بدنامی اٹھاتے ہو۔ یہ کہنا قسمت بھی ایک چیز ہے، یہ کہنا ہے کہ قسمت سے بغیر تخم ریزی کے غلہ پیدا ہوسکتا ہے۔

اگر شریک امتحان ہونا تو [۲۲؍روپئے] ماہوار خرچ کے لے کر باقی ڈیوٹی کو واپس کر دینا، سب رقم کا حساب مجھے بتا دینا۔

والدعاء

شبلی

اعظم گڑھ۔ ۹؍دسمبر [۱۹۰۰ء]

---

[۲۶]

انشاءاللہ ۳۱؍جنوری سے پہلے میں خود علی گڑھ پہنچوں گا۔

مصائب، مصارف اور تکلیفات حد سے گذر گئیں، اس لیے گھبرا کر نکلتا ہوں۔ علی گڑھ دو ایک روز رہ کر معلوم نہیں کہاں جاؤں۔

شبلی

اعظم گڑھ، ۲۰؍جنوری ۱۹۰۱ء

---

[۲۷]

خط پہنچا، تعطیل کھلنے پر روپئے بھیج دیے جائیں گے۔

افسوس تم پر پھر ایک روپیہ بقایہ نہ جمع ہوا۔ ضعف کی حالت میں چلنا پھرنا اور دوڑ دھوپ تم نے ترک نہ کی ہوگی، اس لیے بخار پھر آ گیا۔ تندہی سے علاج اور احتیاط کرو۔

شبلی

بھوپال۔ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۰۵ء

---

[۲۸]

۱۴/ مئی کو اعظم گڑھ میں جلسہ اسلامیہ ہے، اس میں انشاء اللہ میں جاؤں گا۔ وہیں روپیہ بھی ادا کردوں گا۔ تم نے (۱۵۰/ روپیہ) جوندوہ کے لیے دینے کو کہا ہے یہ غالباً زنانہ کے زیور کی قیمت ہوگی یا اور کوئی رقم ہے۔

تم بھی اس زمانہ میں اعظم گڑھ آ ؤ تو بہتر ہے۔ فاطمہ (۳۰) اب بہت بیمار رہتی ہے، اس کا علاج کرنا ضروری ہے۔ میں اعظم گڑھ بلاؤں گا اور ضرورت ہوگی تو لکھنؤ بھی لاؤں گا، اس وقت سے بھی زنانہ بلانا ہوگا۔

شبلی

لکھنؤ، ۲۵/ اپریل ۱۹۰۹ء

---

[۲۹]

عزیزی!

میں تمہارے خط کا جواب اس لیے نہ دے سکا کہ ۲/ مارچ کو الٰہ آباد میں سرکاری کمیٹی میں بلایا گیا تھا اور وہاں سے وقف اولاد (۳۱) کے معاملہ میں کلکتہ جانا پڑا۔ ابھی یہاں آیا ہوں اور غالباً ایک ہفتہ تک رہنا ہو۔ ۱۵/ مارچ کو پھر اسی کے لیے الٰہ آباد جانا ہے۔

شبلی

۱۰/ مارچ ۱۹۱۲ء۔ لکھنؤ

تعلیقات وحواشی

(۱) غالباً حامد حسن نعمانی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ (۲) حامد حسن نعمانی نے علامہ شبلی کے عقد ثانی یعنی دوسری ماں کی آمد سے ناراض ہوکر گھر چھوڑ دیا تھا۔ [حیات شبلی ص ۳۵۹] پہلے دربھنگہ گئے اور پھر وہاں سے قصبہ بہار شریف جا کر خانقاہ یحییٰ منیری کے سجادہ نشین شاہ امین کے مرید ہوکر وہیں مقیم ہوئے۔ پھر اپنے پیر شاہ امین کے کہنے پر واپس آئے، (ایضاً) لیکن پھر ان کی موجودگی میں علامہ شبلی کا نکاح بھی ہوا۔ (۳) جلد ساز احسان علی کے بارے

میں معلومات نہ مل سکیں۔(۴)بعد میں ان کے منجھلے بھائی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کے ہاں نرینہ اولاد محمد فاروق نعمانی عرف للو بابو[۱۹۰۹-۱۹۹۷ء] پیدا ہوئے۔ احمد اسحاق نعمانی اور احمر اسحاق نعمانی ان ہی کے صاحبزادے ہیں۔(۵)علامہ شبلی کے خاندانی بھتیجے اور سابق چیف جسٹس الٰہ آباد ہائی کورٹ۔اس وقت طالب علم تھے اور علی گڑھ میں مقیم تھے۔(۶) کھنڈا ضلع الٰہ آباد میں محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کی سسرال تھی، اسحاق صاحب کی تین شادیاں ہوئی تھیں، پہلی بندول میں، دوسری غالباً اسی کھنڈا میں اور تیسری غازی پور میں۔اول الذکر بیویوں نے کم مدت حیات پائی۔(۷) غالباً محمد اسحاق وکیل کے سسر کا نام ہے۔(۸) آغا خاں: محتاج تعارف نہیں۔(۹) یہ خط اعظم گڑھ سے لکھنؤ معرفت حکیم عبدالولی صاحب (جھوائی ٹولہ) لکھا گیا ہے گویا حامد حسن صاحب اس وقت لکھنؤ میں مقیم اور زیر علاج تھے۔(۱۰)احسان علی، جلد ساز: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔(۱۱) مولوی محمد سمیع علامہ شبلی کے ابتدائی شاگرد اور عزیز جو موضع کنورہ گہنی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، جونپور ججی میں محافظ دفتر تھے۔علامہ شبلی نے جو مجلس موازنہ ترقی قومی بنائی تھی، اس کے ذمہ دار یہی تھے۔ان کے نام علامہ شبلی کے ۵۹ رخطوط مکاتیب شبلی اور نوادرات شبلی میں شامل ہیں۔نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے بھی یہ ایک اہم ذمہ دار تھے۔ان کے ایک بیٹے مختار احمد تھے جو الٰہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ان کی تاریخ پیدائش اور وفات معلوم نہ ہوسکی۔مکاتیب شبلی کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و ادب کے بڑے اداشناس تھے،اسی لیے علامہ شبلی کی شاعری کے بڑے مداحوں اور قدردانوں میں تھے۔انہوں نے علامہ شبلی کے کلام اور خطوط وغیرہ کو محفوظ رکھا اور ان کی تدوین کے وقت سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔(۱۲) ڈپوٹی: ایم۔اے۔کالج علی گڑھ کا بک ڈپو۔(۱۳) میر کلن: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔(۱۴) مختار احمد: مولوی محمد سمیع کے صاحبزادے، علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی تھی، الٰہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔برسوں شبلی کالج انتظامیہ کے رکن رہے۔الٰہ آباد میں وفات پائی۔(۱۵) میاں علی احمد: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔(۱۶) بابو: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔(۱۷) حکیم عبدالولی: جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے مشہور حکیم، علامہ شبلی کے احباب میں تھے اور معالج بھی۔ایک بار حامد حسن کا بھی ان سے علاج کرایا۔(۱۸) میور کالج الٰہ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، اس کے علاوہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔(۱۹) حکیم قنبر علی: حالات معلوم نہ ہوسکے۔(۲۰) مولوی سعید: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔غالباً بندول کے رہنے والے تھے۔(۲۱) ماموں: غالباً مولوی محمد سلیم وکیل کورٹ اعظم گڑھ، جامعہ احمدیہ آرہ کے فاضل اہل حدیث عالم، موضع پھریہا کے رہنے والے تھے۔(۲۲) عثمان: علامہ شبلی کے خاندانی بھتیجے تھے، علامہ شبلی نے اپنے ساتھ علی گڑھ میں رکھ کر تعلیم دلائی تھی، بعد میں شہر الٰہ آباد کے کوتوال مقرر ہوئے۔مکاتیب شبلی میں

کئی مقام پر ان کا نام آیا ہے۔ بقیہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔(۲۳) حمید: علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] صاحب تفسیر نظام القرآن۔(۲۴) تحریک علی گڑھ کے رکن اعظم، علامہ شبلی کے خاص دوست اور جانشین سرسید نواب محسن الملک مولوی مہدی علی [۱۸۳۸-۱۹۰۷ء](۲۵) علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل کورٹ اعظم گڑھ کے سانحہ انتقال کی اطلاع۔(۲۶) انٹرنس کورس فارسی: علامہ شبلی نے طلبائے فارسی کے لیے ایک کورس تیار کیا تھا جو تین کتابوں انٹرنس کورس، ایف۔اے کورس اور بی۔اے کورس فارسی پر مشتمل تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق بی اے کورس فارسی کا ایک نسخہ ڈاکٹر تحسین فراخی لاہور کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ (۲۷) ماریسن: ایم۔اے۔ او کالج علی گڑھ کے پرنسپل۔(۲۸) میر محبوب علی خاں، نظام حیدر آباد کے جاری کردہ وظیفہ کی ماہوار رقم۔(۲۹) شیخ حبیب اللہ کی دوسری اہلیہ، ان کا نام معلوم نہ ہو سکا، ان سے ایک بیٹے محمد پیدا ہوئے، جنھوں نے کلکٹری کا امتحان پاس کیا تھا، لیکن جوائن کرنے سے پہلے یکا یک وفات پائی۔ ان کی جواں مرگی سے شیخ حبیب اللہ کو سخت صدمہ پہنچا۔(۳۰) فاطمہ خانم (م: ۱۹۰۹ء) علامہ شبلی کی بڑی صاحبزادی۔(۳۱) وقف علی الاولاد: علامہ شبلی کا ایک عظیم الشان کارنامہ جس میں وہ پانچ برس تک مسلسل مصروف رہے۔

نوٹ: اس مضمون کے لیے ہم ڈاکٹر سلمان سلطان اور ان کے عزیز قریب کیپٹن سہیل سلطان کے ممنون ہیں کہ ان کی عنایات سے یہ خطوط دستیاب ہوئے۔ افسوس کیپٹن صاحب معارف میں ان خطوط کو دیکھنے سے پہلے ہی اپنے رب حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆

دارالمصنّفین کے اولین رفیق

مولانا حاجی معین الدین ندویؒ

☆مولانا طلحہ نعمت ندوی

حیات سلیمان مصنفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی(۱) کی تصریح کے مطابق دارالمصنّفین کا سب سے پہلا عملہ پانچ افراد پر مشتمل تھا جن میں مولانا مسعود علی صاحب ندوی اس کے منیجر تھے،علامہ سید سلیمان ندوی ناظم اوران کے ساتھ ممتاز عالم ومصنف مولانا عبدالسلام ندوی تھے۔ان کے علاوہ رفیق کی حیثیت سے مولانا حاجی سید معین الدین صاحب استھانوی ندوی تھے،ان کے علاوہ ایک ملازم تھا۔ان چار بزرگوں مین تین شخصیتیں تو ماشاءاللہ مشہور زمانہ ہیں لیکن مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی کے حالات زندگی پر توجہ کم دی گئی ہے،ذیل میں اسی کمی کی تلافی کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

حاجی صاحب کے سوانح میں ان کی طالب علمی اور اس کے بعد کے حالات عام طور پر معروف ہیں،البتہ ان کی پیدائش اور بچپن کا حال بہت کم ملتا ہے،ان کی وفات کے بعد بانی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ(جسٹس نورالہدیٰ بن شمس الہدیٰ)کے حالات اورمدرسہ کے ذکر میں ایک مختصر کتابچہ ''نورہدیٰ'' شائع ہوا تھا جس میں مدرسہ اور اس کے ذمہ داروں اوراساتذہ کا بھی ذکر ہے،حاجی صاحب اس مدرسہ کے پرنسپل تھے،اوراسی عہدہ پر وفات پائی تھی اسی لیے ان کا بھی مختصر تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں ان کے بچپن کے کچھ حالات بھی درج ہیں جو ظاہر ہے ان کے گھر والوں اوراہل خاندان سے معلوم کر کے ہی لکھے گئے ہوں گے اس لیے ان کو ابتدائی حالات کا تنہا ماخذ کہنا چاہیے،بعد میں جو چند مضامین لکھے گئے ان کی بنیاد اسی کتاب پر ہے۔

اس تحریر کے مطابق حاجی صاحب کے والد کا نام سید جان محمد تھا اوران کا مولد ان کی نانہال استھانواں کی مردم خیز بستی تھی،جہاں وہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔(۲) کتاب میں ان کا آبائی وطن

☆استھانواں،بہار شریف۔

شیخ پورہ بتایا گیا ہے اور قریہ گیلانی کو ان کی سسرال لکھا گیا ہے اور یہی بات بعد میں عطاء اللہ پالوی نے بھی لکھی ہے لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی (۳)، کیوں کہ حاجی صاحب کے ایک مضمون میں ان کے نام کے ساتھ ''گیلانی'' کا لفظ ملتا ہے جو ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا ہے، ان کے اعزہ بھی ان کی دادیہال گیلانی ہی بتاتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان کے والد ملازمت یا کسی اور وجہ سے شیخ پورہ شہر میں مقیم ہو گئے ہوں جو بستی گیلانی سے کچھ فاصلے پر ہے لیکن حاجی صاحب کا مولد ان کا نانہالی گاؤں استھانواں تھا، والدین کا بچپن میں انتقال ہو جانے کی وجہ سے انہوں نے استھانواں ہی میں اپنی نانی صاحبہ کی آغوش میں پرورش پائی اس طرح وہ مستقل اپنی نانہال ہی میں مقیم ہو گئے اور وہی ان کا وطن بن گیا، وہاں ان کا گھر بھی موجود تھا جو اب کسی اور کی ملکیت ہے۔

حاجی صاحب ۱۹۰۸ء میں اپنی نانی صاحبہ کے ساتھ حج کے لیے گئے تھے، افسوس کہ ان کی طالب علمی کے حالات بہت کم معلوم ہیں، کہ انہوں نے بچپن میں کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور کب ندوہ پہنچے۔ ندوہ کے دوران قیام وطالب علمی کے کچھ واقعات ان کے رفیق مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مدیر الندوہ وکانفرنس گزٹ علی گڑھ کی یادوں سے معلوم ہو سکے، انہوں نے حاجی صاحب کی وفات پر الندوہ (جولائی ۱۹۴۱ء) میں ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جس میں اپنے اور ان کے دور تعلیم کے واقعات ذکر کر کے یادوں کو تازہ کیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق وہ، مولانا مسعود علی ندوی اور حاجی صاحب تینوں ہم درس تھے، انہوں نے حاجی صاحب کی طالب علمی کے زمانہ سے ان کی شرافت ومروت اور حسن اخلاق، دوسروں کی برائیوں سے گریز اور حتی الامکان اس سے دور رہنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے، جس سے حاجی صاحب کی فطری وطبعی شرافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (۴)

مولانا اکرام اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ''حاجی صاحب طالب علمی کے زمانہ میں بلند نظر وباوقار تھے، عادات واطوار میں شائستگی اور خودداری تھی اور عزت نفس کا پاس، اس لیے کوئی مبتذل اور گھٹیا حرکت ان سے کبھی سرزد نہیں ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ عامیانہ وسوقیانہ صحبتوں سے بچتے تھے۔ البتہ اپنے مخصوص احباب کے حلقے میں وہ بے تکلف اور خوش مزاج نظر آتے تھے، حفظ مراتب کا انہیں خاص خیال رہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے سے کم عمر اور چھوٹی جماعتوں کے طلبہ کو بھی اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ ان سے مساویانہ بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کریں، اسی طرح وہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا پورا احترام کرتے اور ان کے ساتھ تہذیب وشائستگی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اس میں بھی

اعتدال پیش نظر تھا، کسی بلند شخصیت کے سامنے جھکنا یا اس کی ہاں میں ہاں ملانا ان کی عادت نہ تھی، وہ طبعاً آزادخیال تھے اور بے نیازی کی شان ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی‘‘۔(۵)

ان کے شوق مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’اُس زمانہ میں دارالعلوم ندوہ میں اردو عربی کے بہت سے اخبارات آتے تھے، جو طلبہ کے ’’دارالمطالعہ‘‘ میں (جس کا نام اس وقت ’’دارالمعلومات‘‘ تھا) میزوں پر رکھ دیے جاتے تھے۔ دارالمعلومات کا انتظام طلبہ کے ہاتھ میں تھا، ایک زمانہ میں حاجی صاحب بھی اُس کے ناظم تھے، وہ اخبارات فراہم کرنے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم اس زمانہ میں دارالعلوم کی پرانی عمارت کے احاطہ میں بالائی منزل پر رہتے تھے، مولانا مرحوم کے پاس بہت سے اخبارات آتے تھے، لیکن مولانا کو اس طومار کو پڑھنے کی کہاں فرصت تھی، وہ ان اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈال کر میز کے نیچے پھینک دیتے، حاجی صاحب شام کو یہ اخبارات اُٹھالاتے، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مولانا مرحوم ان اخباروں کو کمرہ کے ایک دروازہ سے (جہاں ان کے لکھنے پڑھنے کی میز تھی) باہر پھینک دیتے۔ کمرہ کے نیچے ایک دوسرے کمرہ کا چھپر تھا۔ یہ اخبار اس پر آکر گرتے، حاجی صاحب یہ کرتے کہ ایک لانبا بانس لے کر اس کے سہارے سے یہ اخبار چھپر سے اُتار لیتے اور دارالمعلومات میں لاکر رکھتے‘‘۔(٦)

حاجی صاحب نے دینیات میں تخصص کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں ندوہ سے فراغت حاصل کی، مولانا اکرام اللہ خاں صاحب کے مطابق اس کے بعد وہ وطن چلے گئے اور خود مولانا ندوہ میں الندوہ کے مدیر ہوگئے، شاید اسی دوران (جیسا کہ ان کی ابتدائی سوانح نورہدیٰ میں ہے) حاجی صاحب نے انگریزی میں محنت کرکے دسترس حاصل کی اور اپنے ایک دوست سے اس سلسلہ میں مدد لی، ۱۹۱۵ء میں دارالمصنّفین کے قیام کے بعد حاجی صاحب وہاں تشریف لے آئے۔ ان کے نام علامہ شبلی کے تین خطوط مکاتیب شبلی میں شامل ہیں۔ اور یہ سب کے سب ۱۹۱۴ء کے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی کے عزیز شاگردوں میں تھے، جب دارالمصنّفین میں کام کا آغاز ہوا تو جہاں علامہ سید سلیمان ندوی نے خود علامہ شبلی کے مجوزہ منصوبہ سیرت النبیؐ کی تکمیل کی ذمہ داری قبول کی وہیں حاجی صاحب کو صحابۂ کرام کی سیرت مبارکہ کی ترتیب کی ذمہ داری سونپی گئی، جس میں دو جلدیں حاجی صاحب نے علامہ شبلی کے منہج کے مطابق بہت خوبی سے مکمل کیں، پہلی جلد خلفائے راشدین کے حالات پر ہے اور اسی نام سے شائع ہوئی ہے، دوسری جلد مہاجرینؓ

جلداول کے نام سے مرتب کی جس کا آخری حصہ ان کے ہم نام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مرتب اور مکمل کیا۔ حاجی صاحب کو چند ہی سالوں کے بعد ندوۃ العلماء کی طلب پر وہاں کے کتب خانہ کی فہرست مخطوطات کی ترتیب کے لیے جانا پڑا، اس وقت ان کے رفیق مولانا اکرام اللہ خاں ندوی بھی وہیں تھے، گرچہ ان کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ الندوہ بند ہو چکا تھا، وہاں دونوں دوستوں کو پھر ایک بار یکجائی کا موقع ملا، خان صاحب نے حاجی صاحب کی محنت وکدوکاوش کا مشاہدہ ان الفاظ میں درج کیا: ''حاجی صاحب کے ذمہ جو کام کیا گیا تھا، وہ بہت محنت طلب تھا، کتابوں کی مجوزہ فہرست کے جو عنوان تجویز کیے گئے تھے وہ ایسے تھے کہ ان کی خانہ پُری کے بعد ہر کتاب کے مضامین اور مصنف کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہوجاتے تھے لیکن ان معلومات کے حاصل کرنے کے لیے حاجی صاحب کو پوری توجہ سے ہر کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا، میں برابر دیکھا کرتا تھا کہ حاجی صاحب یہ کام کیسی محنت وشوق سے انجام دیتے تھے''۔(۷) حاجی صاحب کے لیے یہ کام ایسا مبارک ثابت ہوا کہ زندگی کا بیشتر حصہ مختلف مقامات میں اسی خدمت میں بسر ہوا، ان کے علمی کاموں کا اکثر حصہ اسی فہرست سازی پر مشتمل ہے۔

حاجی صاحب اس کام کی تکمیل کے بعد پھر دوبارہ دارالمصنّفین لوٹ کر نہیں آئے، البتہ اسی کام کی مناسبت سے انہیں امپیریل لائبریری کلکتہ میں بلایا گیا، جہاں انہوں نے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کی خدمت انجام دی۔(۸) حاجی صاحب نے دارالمصنّفین میں تین سال (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۷) خدمت انجام دی، اس کے بعد ندوہ میں بھی دو سال (۱۹۱۸ تا ۱۹۲۰) گذارے، کلکتہ میں انہوں نے تین برس (۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء) کام کیا۔ ''۱۹۲۴ء میں خدابخش لائبریری کے عربی مخطوطات کے کیٹلاگر کی بحالی کا اعلان ہوا، چونکہ کلکتہ گھر سے بہت دور تھا اور پٹنہ ان کے گھر سے بہت قریب تھا، اس لیے حاجی صاحب نے اس کو ترجیح دیا اور خوش قسمتی سے ان کی بحالی بھی یہاں ہوگئی اس لیے کلکتہ کی ملازمت ترک کرکے پٹنہ چلے آئے۔ خدابخش لائبریری میں عربی مخطوطات کے کیٹلاگر کی حیثیت سے حاجی صاحب نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک کام کیا۔ یہ ملازمت ان کے حسب حال تھی، کیوں کہ موصوف نہایت شریف، نیک طبع، متواضع اور خاموش طبیعت کے آدمی تھے اور خدابخش لائبریری کی ظاہری فضا نہایت پرسکون تھی، جو ان کو بہت پسند تھی''۔(۹)

حاجی صاحب نے بانی کتب خانہ پر اپنے مضمون میں لکھا ہے: ''فروری ۱۹۲۴ء میں خاکسار کا

تقرر عمل میں آیا، درحقیقت یہی وہ وقت ہے جب سے عربی مخطوطات کی فہرست سازی کا کام پوری تیزی اور تندہی کے ساتھ شروع ہوا، ممکن تھا کہ عربی مخطوطات کی فہرست بھی مکمل ہوکر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی مگر حکومت کی مالی دشواریوں کے باعث فروری ۱۹۲۴ء میں خاکسار کا عہدہ معرض التوا میں آ گیا، خاکسار نے اپنی ہشت سالہ مدت ملازمت میں فہرست کی چھ جلدیں مکمل کیں اور ساتواں کا ایک حصہ مکمل ہو چکا تھا کہ اس سے بحسرت اندوہ دست کش ہونا پڑا''۔(۱۰)

لیکن حاجی صاحب کو اس کام اور کتب خانہ سے ایک انسیت ہوگئی تھی اس لیے جب مدرسہ شمس الہدیٰ میں تقرری ہوئی تو قربت کی وجہ سے وہ اس سے استفادہ کرتے رہے، حاجی صاحب نے لکھا: ''جب خاکسار کا عہدہ معرض تخفیف میں آیا تو بہ ظاہر اس عام نوازش سے استفادہ کی امید باقی نہیں رہی مگر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں پرنسپلی ملنے پر اس ناچیز کی دیرینہ خدمت بھی بالآخر سعی نامشکور نہیں رہی''۔(۱۱)

عطاء اللہ پالوی کے بقول: ''یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کہ حکومت کو مالی دشواری ہوگئی تھی اس لیے وہ ہٹا دیئے گئے تھے۔ایک مولوی معین الدین کے مشاہرہ کی بچت سے حکومت کی مالی دشواری کس حد تک دور ہوئی ہوگی؟ اصل یہ ہے کہ علامہ موصوف اس آرٹ سے بے بہرہ اور اس کے گُر سے ناواقف تھے کہ ہندوستانی بالخصوص بہاری ارباب اختیار کو کیسے رام کیا جاتا ہے؟

حاجی صاحب مروجہ معیار پر پورے نہ اترے، اس لیے مالی دشواری ظاہر کی گئی اور جوں ہی وہ ہٹے، سرکار کی ساری ''مالی دشواری'' دور ہوگئی۔ان کے بعد مولانا مسعود عالم ندوی بھی مستقل نہ ہو سکے اور آخر میں اسی جرم میں وہ بھی ہٹا دیے گئے تھے، ورنہ اس وقت حکومت کو کیا ''مالی دشواری'' پیش آتی تھی؟(۱۲)

خدا بخش لائبریری سے سبکدوشی کے بعد حاجی صاحب ۱۹۲۳ء میں دائرۃ المعارف حیدر آباد چلے گئے، وہاں تقریباً ایک سال رہے، اس دوران وہاں سے حافظ ابن حجر کی الدرر الکامنہ شائع ہوئی جو آٹھویں صدی کے اہل علم کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اس میں ہندوستان کے اہل علم کا ذکر نہیں تھا اس لیے اس کے ساتھ مولانا سید عبدالحی حسنی کی نزہۃ الخواطر کی دوسری جلد جو آٹھویں صدی کے ہندوستانی بزرگوں پر ہے شامل کردی گئی، اس میں ہندوستانی مقامات کے نام عربوں کے لیے نئے تھے، اس لیے حاجی صاحب کو عربی میں ان مقامات کے تعارف کی ذمہ داری دی گئی، کتاب کی

اشاعت کا کام ان کے ہم وطن وعزیز مولانا سید ہاشم ندوی استھانوی کے زیر ادارت ہوا تھا عجب نہیں کہ انہوں نے ہی ان کو یہ ذمہ داری سونپی ہو، بہر حال "معجم الامکنة التی لها ذکر فی نزهة الخواطر" کے نام سے یہ کتاب شائع ہوگئی اور اس طرح انہیں اپنے استاذ مولانا سید عبدالحی حسنی کے کام کی توضیح وترجمانی کا بھی موقع ملا۔

اس کے بعد تقریباً ایک یا ڈیڑھ سال حاجی صاحب رامپور کے مشہور زمانہ کتب خانہ میں رہے، نہیں معلوم کہ وہاں حاجی صاحب کو بلایا گیا تھا یا از خود دائرۃ المعارف چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے اور اس کے اسباب کیا تھے، تاہم اس مختصر مدت میں حاجی صاحب نے حاجی عارف قندھاری کی "طبقات اکبری" کی تصحیح کی اور اس پر انگریزی میں حواشی لکھے، جس کی وضاحت اس کتاب کے مقدمہ میں امتیاز علی عرشی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "بحکم بندگان اعلیٰ حضرت نواب رامپور دام اقبالہ کار تصحیح وتحشیہ بہ حاجی معین الدین ندوی مرحوم کہ دوران زمان تالیف فہرست خطبات فارسی کتاب خانہ رضا مشغول بودہ تفویض شد، مشار الیہ با کمال دقت نظر کار مفوض را بانجام رسانید، وحواشی را بفرمودۂ جناب سید ابو محمد مرحوم کہ نگران اعلیٰ کتاب خانہ بودند با انگلیسی نوشت"۔(۱۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اصلاً وہاں اپنی فن مخطوطہ شناسی ہی کے کام اور اس کی ترتیب کے لیے گئے تھے، لیکن وہاں کے ناظم کے حکم پر انہوں نے اس کتاب کی تدوین کا بھی کام کیا، البتہ حاجی صاحب نے وہاں مخطوطات پر کیا کام کیا اس کا بہت زیادہ علم نہیں۔

کچھ ہی دنوں کے بعد جب مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پرنسپل کی جگہ خالی ہوئی تو حاجی صاحب کی سابقہ خدمات کی بنا پر حکومت بہار نے اس عہدہ کے لیے ان کو طلب کیا، حاجی صاحب پٹنہ میں ایک طویل عرصہ گذار بھی چکے تھے، اس کے مشہور کتب خانہ سے مانوس تھے، نیز یہ گویا ان کا وطن ہی تھا اس لیے حاجی صاحب نے یہ پیشکش قبول کرلی اور نومبر ۱۹۳۵ء کو وہ پرنسپل ہوگئے۔ حاجی صاحب گرچہ اب تک علمی وتصنیفی کاموں ہی میں لگے ہوئے تھے، تدریسی اور انتظامی میدان میں انہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن جب وہ اس میدان میں آئے تو یہاں بھی اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی نبھائی، حاجی صاحب کے دور ادارت کو عام طور پر مدرسہ شمس الہدیٰ کا کامیاب دور مانا جاتا ہے، حاجی صاحبؒ کی پانچ سالہ خدمات نے مدرسہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کردیا اور اس کے

لیے وہ رہنما خطوط واضح کیے جو آج بھی اس کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، حاجی صاحب نے یہاں انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ حدیث شریف کی اعلیٰ کتابوں کی تدریس کی خدمت بھی انجام دی، اس دور کے تلامذہ میں ہمیں دو مشہور و ممتاز نام ملتے ہیں، ایک مشہور محقق جناب مختار الدین احمد آرزو ہیں جنھوں نے ان سے بخاری شریف پڑھی تھی، دوسرے ممتاز اہل قلم جناب مولانا سید عروج احمد صاحب قادری جنھوں نے حاجی صاحب کی زیر نگرانی طلبہ کا ماہنامہ الشّمس نکالا۔

حاجی صاحبؒ نے پانچ سال خدمت انجام دے کر دوران خدمت ۴؍ مئی ۱۹۴۱ء کو وفات پائی اور پٹنہ میں مدفون ہوئے۔ اسی سال حاجی صاحب کو ان کی مادر علمی ندوۃ العلماء کا رکن منتخب کیا گیا تھا جیسا الندوہ کے اپریل ۱۹۴۱ء کے شمارہ میں مولانا عبدالغفور شررندوی معاون ناظم ندوۃ العلماء کے قلم سے کارروائی رپورٹ میں اس کی اطلاع ہے، لیکن افسوس کہ اسی سال کے دو ماہ بعد جون کے شمارہ میں مدیر رسالہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے قلم سے شذرات میں ان کا ماتم ہے۔

ان کی وفات پر علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ان کا ماتم کیا اور ان کے فضائل و کمالات بیان کیے۔

حاجی صاحب کی تصانیف کا دائرہ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں کو محیط ہے، اس سے ان کی علمی عظمت و استعداد کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، حاجی صاحب نے آخر عمر میں حدیث کی بلند پایہ کتابوں کی تدریس کی خدمت بھی انجام دی اس سے علم حدیث سے ان کے تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اردو زبان اور تاریخ میں ان کی دسترس کی شہادت تو خود ان کی کتابوں سے ملتی ہے لیکن حاجی صاحب کا اصل کمال جس میں ان کی عبقریت کی شہادت موجود ہے وہ مخطوطہ شناسی کی صلاحیت ہے۔

حاجی صاحب زود نویس نہیں تھے، انہوں نے مضامین و مقالات کم ہی تحریر کیے، دارالمصنّفین کے دوران قیام بھی معارف میں ان کے کم مضامین شائع ہوئے، لیکن حاجی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اہمیت و معنویت سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کرسکتا، کیوں کہ تصنیف کا اصول ہے کہ اس میں کمیت نہیں بلکہ کیفیت اور معنویت کا اعتبار ہوتا ہے، اس ناحیہ سے حاجی صاحب نے جو کام کیے وہ بجائے خود بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی باضابطہ علمی کاوش تو دارالمصنّفین سے شائع شدہ ان کی دو کتابیں ''خلفائے راشدین'' اور ''مہاجرین'' ہیں، اول الذکر کتاب کے آغاز میں

خلافت راشدہ کی شرح وتوضیح میں ان کا مقدمہ بھی قیمت میں کسی تصنیف سے کم نہیں، زبان و بیان کی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اردو میں حاجی صاحب کی صرف یہی دو کتابیں ہمارے علم میں ہیں۔ عربی میں ان کا رسالہ ''معجم الامکنۃ التی جاء ذکرھا فی نزھۃ الخواطر'' ان کی عربی انشا نگاری کا نمونہ ہے۔ حاجی صاحب کی یہ کتاب بقامت کہتر بقیمت بہتر کی مصداق ہے، ہر مقام کا تعارف اختصار و جامعیت کا نمونہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی علمی تاریخ سے متعلق اہل عرب کی کتابوں میں اس کے حوالے نظر آتے ہیں، اس پر علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا عربی میں مقدمہ ہے، اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی خدا بخش لائبریری نے شائع کردیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا حاجی صاحب کا سب سے اہم کام قدیم مخطوطات کی فہرست سازی ہے۔ ندوہ، امپیریل لائبریری کلکتہ، خدابخش لائبریری پٹنہ اور اخیر میں کتب خانہ رامپور میں انہوں نے یہی خدمت انجام دی، لیکن خدابخش لائبریری کے انگریزی میں مفصل فہارس مخطوطات کے علاوہ مذکورہ کتب خانوں میں سے کسی اور کتب خانہ میں حاجی صاحب کی مرتب کردہ فہرست نہیں ملتی۔

حاجی صاحب نے خدابخش لائبریری میں فہرست مخطوطات کی جو سات جلدیں انگریزی میں مرتب کی ہیں وہ عطاء اللہ پالوی کی تصریح کے مطابق حسب ذیل ہیں:

جلد ۱۲۔ جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔

جلد ۱۵۔ جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔

جلد ۱۸۔ حصہ اول، ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔

حصہ دوم۔ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

جلد ۲۰۔ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔، یہ وہ جلد ہے جس کو ادھوری چھوڑ کر ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب جرمنی چلے گئے تھے اور ندوی صاحب نے اس کو مکمل کیا۔

جلد ۲۳۔ جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔

جلد ۲۴۔ جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی، اس جلد کو مولوی عبدالحمید صاحب مکمل نہ کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا، اسے ندوی صاحب نے مکمل کیا۔ (۱۴)

فروری ۱۹۲۸ء کے معارف کے شمارہ میں حاجی صاحب کی تیار کردہ جلد پر ''باب التقریظ والانتقاد'' کے تحت ایک مفصل اور وقیع تبصرہ شائع ہوا تھا۔ جس کے اخیر میں (ج) لکھا ہے جو شاید مولانا

عبدالجلال ندوی کا مخفف ہے۔ اس میں انہوں نے ''مشرقی کتب خانہ بانکی پور کی بارہویں جلد مرتبہ مولوی حاجی معین الدین صاحب مصنف خلفائے راشدین'' کے زیر عنوان پہلے یہ لکھا کہ ''اس کتب خانہ کی متعدد فہرستوں پر معارف کے پچھلے نمبروں میں تبصرہ کیا جاچکا ہے''۔ اس کے بعد اس کے مشمولات پر مفصل روشنی ڈالنے کے بعد لکھا:

''اس فہرست کو ہمارے دوست مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی نے ترتیب دیا ہے اور مسودہ اور پروف کی باز خوانی مسٹر اے ہارن اور ڈاکٹر عظیم الدین نے کی ہے''۔

لکھتے ہیں: ''حاجی صاحب ندوہ کے ایک مایہ ناز فرزند ہیں، انہوں نے دارالمصنّفین میں بھی کچھ دنوں ہماری رفاقت کی ہے۔ معارف کی ابتدائی جلدوں میں ان کے متعدد مضامین نکلے ہیں، وہ ہمارے یہاں سے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرستیں ترتیب دینے کلکتہ گئے، چند سال وہاں یہ کام کرتے رہے، پھر اسی خدمت کے لیے بانکی پور کے کتب خانہ نے ان کو اپنے اسٹاف میں داخل کرلیا۔ اس فہرست کی ترتیب میں ان کو جو کچھ محنت کرنی پڑی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بہت سے نسخے جن کا اس فہرست میں تذکرہ نا تمام تھا، بعض پر نہ تو مصنف کا نام تھا نہ تصنیف کا، بعض پر غلط نام درج تھے، جلال الدین سیوطی کی ''بغیۃ الوعاۃ'' پر ''الفتح القریب اور مغنی اللبیب لکھا ملا، اسی طرح اور کتابوں پر بھی غلط اندراجات تھے، مولانا نے نہایت جانفشانی سے ہر کتاب کے متعلق نہ صرف اس کا اور اس کے مصنف کا نام معلوم کیا، بلکہ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ کتابیں کن زمانوں میں، کن حالات کے اندر، کن کن کتابوں کی مدد سے تیار ہوئیں۔ جن جن کتابوں پر کسی عالم، بادشاہ، امیر یا قابل ذکر بزرگ کے دستخط ہیں انہوں نے ان سب کی شخصیتوں کو نمایاں کیا ہے۔ اور ان ماخذوں کا حوالہ بھی دیا ہے جن سے ان بزرگوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ ہر کتاب کے ذکر کے ساتھ وہ ان مقامات کا بھی پتہ دیتے ہیں جہاں جہاں ان کے اور نسخے پائے جاتے ہیں۔ عام صورت ترتیب وہی ہے جو پچھلی فہرستوں کی ہے، لیکن پھر بھی انہوں نے جیسا کہ دیباچہ میں مسٹر جے اے جیب فرماتے ہیں، اس فہرست کی ترتیب میں انہوں نے اپنی مستثنیٰ قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ ہر کتاب کا تذکرہ ایک مختصر تبصرہ ہے جس میں اس کتاب کی تمام ندرتوں اور معنوی خوبیوں کی روح اتر آئی ہے۔

یہ فہرستیں انگریزی میں لکھی جارہی ہیں اور یہ جلد بھی انگریزی ہی زبان میں ہے، لیکن لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اس کا لکھنے والا وہ شخص ہے جو ایک دن بھی کسی انگریزی اسکول میں نہیں گیا،

اس قسم کی کتابوں کی فہرست اور تلاش و تحقیق عموماً یورپ کی مشرقی تعلیم کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، مگر اس کے مؤلف نے دارالعلوم ندوہ اور دارالمصنّفین کے سوا ایک قدم بھی باہر نہیں نکالا، ایسی صورت میں اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے کہ قدیم تعلیم میں جدت کا ذرا رنگ پیدا کر دیا جائے تو

دیگراں نیز کنند آں چہ مسیحامی کرد

موصوف نے انگریزی خود دارالعلوم میں پڑھی اور اس کے بعد ذاتی مطالعہ اور مشق جاری رکھ کر اپنی لیاقت بڑھائی اور اس قابل ہوئے کہ وہ بے تکلف علمی تاریخ پر اس زبان میں قلم اٹھا سکیں، یہ بھی اتفاق ہے کہ ۱۳/ برس کی خاموشی کے بعد ایک ہی سال میں ان کی دو کتابیں دو جگہ سے شائع ہوئیں، فہرست کتب خانہ گورنمنٹ پٹنہ سے اور خلفائے راشدین دارالمصنّفین سے اور بحمد اللہ کہ دونوں نے قبولیت حاصل کی۔ہم اس سعادت عظمیٰ پر اپنے دوست کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں''۔(۱۵)

ان کی وفات پر مولانا ریاست علی ندوی نے ماہنامہ ندیم گیا کے اداریہ میں لکھا تھا: ''علمی و تعلیمی حلقہ میں یہ خبر دلی رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۴/ مئی ۱۹۴۱ء کو صبح کے وقت اس دارفانی کو الوداع کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون ....مرحوم ہماری جماعت کے ایک سنجیدہ، پروقار اور خاموش علمی و تعلیمی خدمت انجام دینے والے تھے''۔

اس کے بعد حاجی صاحب کے حالات کا ایک خاکہ پیش کرنے کے بعد لکھا: ''ہماری غیر معمولی توقعات ان سے وابستہ تھیں، افسوس کہ اب وہ خواب و خیال ہوگئیں''۔(۱۶)

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی نے الندوہ کے شذرات میں لکھا: ''الندوہ کے حلقہ میں یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ پچھلے مہینے مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی رئیس الاساتذہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے ایک مختصر علالت کے بعد اس جہاں فانی سے انتقال فرمایا۔مرحوم ندوہ کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں تھے۔اور یہاں کی تعلیم و تربیت کا بہت عمدہ نمونہ تھے، تصنیف و تالیف کا ذوق شروع سے تھا''۔(۱۷)

معارف میں سید صاحب نے ان کی وفات پر جو تحریر قلمبند کی وہ یادرفتگاں میں بھی شامل ہے، جس کے اخیر میں سید صاحب نے حاجی صاحب کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: ''وہ نہایت خاموش طبیعت، ملنسار، متواضع اور نیک دل تھے، وطن صوبہ بہار کے دو مشہور گاؤں گیلانی اور

استھانواں میں تھا،نوجوانی ہی میں جب وہ دارالعلوم میں پڑھتے تھے حج سے مشرف ہوئے تھے،اسی لیے وہ ہماری جماعت میں حاجی صاحب کے نام سے ایسے مشہور و معروف تھے کہ یہ ان کا اصلی نام کا جزو بن گیا تھا،انگریزی تعلیم صرف ندوہ میں چند ریڈروں تک پڑھی مگر کام کرنے پر اپنی ذاتی محنت سے اتنی ترقی کی کہ انگریزی میں فہرست کی دو تین جلدیں ایسی لکھیں کہ اہل بصیرت نے بھی ان کی تعریف کی۔آخر زمانہ میں وہ کتب حدیث کا درس دیتے تھے اور یہی ان کا آخری کارنامہ ہے،اللہ تعالی اس مجموعہ فضل وکمال واخلاق کو اپنی عطا ومغفرت سے سرفراز اور اس کی خدمتوں کو قبول فرمائے"۔(۱۸)

حواشی

(۱) حیات سلیمان،طبع اول،ص۱۰۱،حاشیہ میں شاہ صاحب نے حاجی صاحب کا اجمالی تعارف کرایا ہے، حاجی معین الدین صاحب کا وطن استھاواں بہار تھا،ندوہ سے فراغت کے بعد ۱۹۱۴ء میں دارالمصنّفین کے رفیق مقرر ہوئے،یہاں کے دوران قیام خلفائے راشدین اور مہاجرین جلد اول لکھی،پھر امپیریل لائبریری کلکتہ میں فہرست کی ترتیب پر مقرر ہوئے،یہاں سے خدابخش لائبریری پٹنہ میں چلے گئے اور عربی کتابوں کی فہرست کی کئی جلدیں انگریزی میں مرتب کیں جو چھپ چکی ہیں،کچھ دنوں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں رہے اور ہندوستان کے تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی میں لکھا،آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوگئے تھے اور یہیں ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔(۲) نورہدیٰ ازمحفوظ الحسن شمسی مطبوعہ برقی مشین پٹنہ ۱۹۴۱ء۔(۳) مشاطہ گان ادب از عطاء اللہ پالوی مطبوعہ پٹنہ۔(۴) الندوہ،لکھنو جولائی ۱۹۴۱ء۔(۵) ایضاً۔(۶) ایضاً۔(۷) ایضاً۔ (۸) مشاطہ گان ادب،یادرفتگان،نورہدیٰ(۹) مشاطہ گان ادب(۱۰) مولوی خدابخش خاں،حیات اور کارنامے مطبوعہ خدابخش لائبریری پٹنہ ۲۰۰۱ء،ص۶۶ (۱۱) ایضاً۔(۱۲) مشاطہ گان ادب۔(۱۳) دیباچہ مصحح،ص۹ تاریخ اکبری معروف بہ تاریخ قندھاری مطبوعہ رضا لائبریری رامپور۔(۱۴) مشاطہ گان ادب۔(۱۵) معارف فروری ۱۹۲۸ء۔(۱۶) ندیم گیا،مئی ۱۹۱۴ء(۱۷) الندوہ جون ۱۹۱۴ء۔(۱۸) معارف مئی ۱۹۱۴ء۔

اخبار علمیہ

’’حدودِ حرم کی نشانیوں کی تاریخ‘‘

مکہ میں حرم کے قریب دو نشانیاں نصب ہیں جن سے حدود حرم کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی یہ وہ مقامات ہیں جہاں سے حرم کے حدود شروع یا ختم ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سعودی مؤرخ ڈاکٹر فواز الدھاس کا کہنا ہے کہ یہ عمل حضرت ابراہیمؑ کے دور سے جاری ہے۔ اس کی پہلی نشانی پہاڑی کی چوٹیوں پر بنائی گئی تھی جس کے نشانات اطراف و جوانب میں آج بھی موجود ہیں۔ ماقبل اسلام بھی سلاطین ان نشانیوں کا پاس ولحاظ کرتے رہے ہیں۔ آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر حضرت تمیمؓ بن اسد الخزاعی کو حرم کی یادگاری علامتیں بنانے کی ہدایت فرمائی۔ ان علامتوں میں بنو عباس کے عہد تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر الدھاس کے بیان کے مطابق پہاڑی چوٹیوں پر چاروں سمتوں میں کل ۱۱۰۴ نشانیاں قائم کی گئیں۔ ان علامتوں کو بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا اور ہر پہلو سے ان کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ جن پہاڑوں پر نشانیاں بنائی جاتیں ان میں وہاں کے بجائے دوسری جگہوں کا پتھر لگایا جاتا۔ اس وقت حدود حرم کی نشانیاں یا یادگاریں مکہ اور طائف روڈ پر جامعہ ام القریٰ کے قریب، مکہ اور طائف روڈ پر الشرائع کے مقام پر صنعتی ژون کے بالمقابل، نیوجدہ، نیو مکہ روڈ اور مکہ-مدینہ شاہراہ پر مسجد عائشہ کے قریب بنائی گئی ہیں۔ مکہ کے داخلی راستہ پر حرم مکی کے قریب ۲ علامتیں ہیں جو وہاں سے مکہ میں داخل ہونے والے حدود حرم کا تعین کرتی ہیں اور واپس جانے والوں کے لیے وہاں حرم کی حدود ختم ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ (روز نامہ راشٹریہ سہارا، لکھنؤ، ۲ر جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۱۲)

’’زمین میں نئے مقناطیسی علاقوں کی دریافت‘‘

سائنس دانوں نے کرۂ ارض کو اوپر، نیچے اور اندرونی سطح بالترتیب Mantle,Crust اور Core میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے مطابق مقناطیسی لہریں اب تک صرف کور کے اندرونی حصہ اور اوپر کی سطح میں دریافت ہوئی تھیں اور مینٹل میں مقناطیسی لہروں کے وجود سے سائنس داں لاعلم تھے۔ لیکن ایک نئی تحقیق میں آئرن آکسائڈ (Iron Ocide) کی ایک مخصوص شکل ہیماٹائٹ (Hematite) میں اس صلاحیت کا پتہ چلا ہے جو مقناطیسی خوبیوں کو محفوظ رکھ سکے۔ زمین مقناطیسی لہروں سے گھری ہوئی ہے۔

اس کے متعدد فوائد میں یہ ہے کہ ان کے سبب زمین پر موجود زندگی خلائی ذرات اور نقصان دہ شعاعوں کی ایذا رسانی سے محفوظ رہتی ہے۔ کچھ جانور ان سے اپنی سمت طے کرنے میں مدد حاصل کرتے ہیں۔ ان کا منبع و مصدر سطح زمین سے چھ ہزار کلومیٹر نیچے موجود زمین کا ''کور'' اور قدموں کے نیچے موجود زمین کا کرسٹ ہے۔ اوپری سطح سے نیچے ۳۵ سے ۲۹۰۰ کلومیٹر کے درمیان زمین کا کرسٹ ہے۔ اوپری سطح سے نیچے کی سطح یعنی مینٹل میں مقناطیسی لہروں کی عمل داری بالکل نہیں ہے۔ لیکن ہیماٹائٹ میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ مینٹل کے اندر بھی اپنی مقناطیسی صلاحیتوں کو باقی رکھ سکتا ہے۔ اس دریافت کے کامیاب مطالعہ اور تجربات کے ذریعہ سائنس داں مریخ پر مقناطیسی لہروں کے وجود اور ان کے بہتر استعمال کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ زمین کے مینٹل کی طرح مریخ پر بھی مقناطیسی لہروں کے وجود کے سلسلہ میں سائنس دانوں کو زیادہ علم نہیں ہے۔

(اردو ماہنامہ سائنس، نئی دہلی، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۳۳)

''ایمانداری کی تفتیش کا عجیب و غریب طریقہ''

انسانی رویوں کا مطالعہ کرنے والے محققین نے ''شہری ایمانداری'' کے نام سے ایک مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد ایمانداری کا پتہ لگانا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس مہم میں ۴۰ ملکوں کے ۳۵۵ شہروں میں ۱۷/ہزار پرس مختلف مقامات پر گرائے گئے یا بینکوں کے کیشئر کو یہ کہہ کر دیے گئے کہ یہ انہیں بینک سے ملے ہیں۔ دنیا بھر میں اس پروجیکٹ کو پہلے چھوٹے پیمانے پر فن لینڈ سے شروع کیا گیا تھا۔ محققین نے اس مہم میں پہلے بغیر رقم یا چھوٹی رقم جیسے ۱۳/ڈالر اور بڑی رقم جیسے سو ڈالر کے ساتھ گرائے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ زیادہ رقم والے پرس چھوٹی رقم کے مقابلہ میں زیادہ واپس کیے گئے۔ اس مہم کے نتائج کے مطابق ۱۰۰/ڈالر پر مشتمل پرس ۷۲ فیصد اور ۱۳/ڈالر پر مشتمل پرس کی واپسی کی شرح ۶۱/فیصد تھی اور ۴۶ فیصد بغیر رقم والے پرس بھی واپس کیے گئے۔ اس مہم کے نتائج جریدہ ''سائنس'' میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سے محققین نے یہ نتیجہ برآمد کیا کہ ایمانداری کا تعلق مالی فوائد سے نہیں بلکہ اس کا انحصار اس پر ہے کہ لوگ بے ایمانی کرکے کیسا محسوس کرتے ہیں۔

(انقلاب وارانسی ۳۰/جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۱۱)

''بنگلہ دیش کی پرکشش مسجد''

بنگلہ دیش میں ۲۰۱ رگنبدوں پر مشتمل پرکشش مسجد دنیا بھر کے زائرین کی توجہ کا مرکز بن چکی ہے۔ڈھاکہ سے تقریباً ۱۴۰ رکلومیٹر دور ضلع تنجیل میں یہ جھنائی ندی کے کنارے تعمیر کی گئی ہے۔ ۴۵۱ رفٹ اونچے اس کے مینارہ کا شمار دنیا کے طویل ترین میناروں میں ہوتا ہے۔مسجد کے احاطہ میں ایک ہیلی پیڈ ،ضعیف خانہ،یتیم خانہ اور ایک رفاہی شفاخانہ بھی ہے۔ بہ یک وقت پندرہ ہزار مصلیوں کی اس میں گنجائش ہے۔تقریباً ۲۰۱ رگنبدوں میں سب سے اونچے گنبد کی اونچائی ۷۹ فٹ ہے اور بقیہ ۴۲ فٹ اونچے ہیں۔مسجد کی ٹائلس اور سنگ مرر اٹلی ، جرمنی، ترکی، سوئٹزر لینڈ اور چین سے منگوائے گئے ہیں۔ (ینگ مسلم ڈائجسٹ انگریزی، جولائی ۲۰۱۹ء،ص ۳۴)

''ہائی اسکول کے بچوں پر تحقیق''

یونیورسٹی آف مونٹریل کے محققین نے ہائی اسکول کے چار ہزار بچوں پر چار سال تک تحقیق کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ یہ بچے سوشل میڈیا یعنی سماجی ذرائع ابلاغ پر روزانہ اوسطاً ۹ گھنٹے صرف کرتے ہیں۔جیسے جیسے یہ بچے بڑے ہوتے جاتے ہیں ان میں کمزوری،تعب وتکان اور منفی سوچ بڑھتی جاتی ہے۔اس سے ماقبل ماہرین سماجیات یہ کہتے تھے کہ ٹی وی یا سماجی ذرائع ابلاغ پر زیادہ وقت دینے سے بچوں میں منفی رجحان کے فروغ پانے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر توجہ نہیں دی جاتی تھی۔تاہم اس تجزیہ سے ان کے خیالات کی تصدیق ہوتی ہے۔ محققین کے سامنے سب سے افسوس ناک بات یہ آئی کہ ۱۲ سے ۱۶ سال کے ان بچوں میں ہر آنے والے سال میں سوشل میڈیا پر وقت گزارنے میں اضافہ ہوا۔محققین نے رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان بچوں میں ویڈیو گیم کھیلنے کی عادت تو کم ہوئی ہے لیکن کمپیوٹر پر وقت گزارنے کی عادت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔(ہندی روزنامہ،ہندوستان، وارانسی، ۱۸ر جولائی ۲۰۱۹ء،ص ۱۶)

(ک۔ص،اصلاحی)

پروفیسر براؤن کا مکتوب

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی☆

پروفیسر ای۔جی۔براؤن (۱۸۶۲-۱۹۲۶ء) کا یہ مکتوب جو ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ یہ مکتوب عربی زبان میں ہے اور دارالمصنّفین کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کی جانب سے جو وفد برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کے دورے پر بھیجا گیا تھا، اس کے تین بنیادی ارکان میں ایک سید صاحب بھی تھے۔ ان کو یہ ذمہ داری تفویض کی گئی تھی کہ وہ دینی نقطہ نظر سے وفد کے مطالبات (۱) کی وضاحت کریں۔ مذہبی اور تاریخی حیثیت سے انگریزی اخباروں میں وفد کے خلاف جو مضامین شائع ہوں ان کا جواب دیں، اور اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ان کو اس تحریک سے آگاہ کریں اور ان کی ہمدردی حاصل کریں۔ (۲)

لندن پہنچ کر سید صاحب نے ایک طویل خط عربی زبان میں پروفیسر براؤن کو لکھا اور اسی مضمون کا دوسرا خط پروفیسر مارگولیتھ (ف ۱۹۴۰ء) کو۔ براؤن کے نام مرسلہ خط کا اردو ترجمہ سید صاحب ہی کے قلم سے ''برید فرنگ'' کے آخر میں شامل ہے۔ (۳)

پروفیسر براؤن مستشرقین کی جماعت میں شریف النفسی، انصاف پسندی اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی حمایت میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کا اختصاص فارسی زبان و ادب تھا۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ ان کی مشہور کتاب ''اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' ہے۔ انہیں فارسی زبان و ادب اور تمدن سے ہی شغف نہ تھا بلکہ اہل فارس کے لیے بھی نہایت مخلصانہ جذبات رکھتے تھے۔ سید صاحب معارف مارچ ۱۹۲۲ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

☆ ریاض، سعودی عرب۔

"پروفیسر موصوف عام مستشرقین کی طرح صرف پیشہ کے طور پر اورینٹلسٹ نہیں ہیں بلکہ حقیقت میں ان کو مشرق، مشرقیات اور اسلامی علوم سے عموماً اور ایران سے خصوصاً ایک شغف ہے، ایک عشق ہے۔ انہوں نے نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ اپنے رتبے سے نیچے اتر کر سیاسی حیثیت سے بھی مشرق اور ایران کی گراں بہا خدمتیں انجام دی ہیں"۔(۴)

روس کی توسیع پسندانہ اور ظالمانہ پالیسیوں کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے اس کے شدید مخالف تھے۔ سنہ ۱۸۷۷ء میں روس اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑی تو ترکی کی حمایت میں ان کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ با قاعدہ عثمانی فوج میں بھرتی ہو کر روسیوں سے لڑنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر یہی کچھ پندرہ سولہ سال رہی ہوگی۔ جنگ بند ہو جانے کی وجہ سے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی لیکن اسی مقصد نے انہیں پہلے ترکی زبان سیکھنے پر آمادہ کیا، پھر ترکی نے فارسی اور عربی کی راہ دکھائی۔ بنیادی تعلیم تو انہوں نے طب کی حاصل کی تھی اور سنہ ۱۸۸۷ء میں بلاد فارس کا سفر طب کے استاد کی حیثیت ہی سے کیا تھا مگر ایک سال بعد جب وہاں سے واپس ہوئے تو انہیں کیمبرج میں فارسی کا استاد مقرر کیا گیا اور چار سال کے بعد چارلس ریو (ف ۱۹۰۲ء) کی جگہ خالی ہوئی تو اس پر عربی کے پروفیسر بنائے گئے۔(۵)

سنہ ۱۹۲۲ء میں ان کی ساٹھویں سالگرہ پر ایک ارمغانِ علمی ان کی خدمت میں پیش کیا گیا جو ۱۱ رملکوں کے ۴۳ راہل علم کے مضامین پر مشتمل تھا۔ یہ ارمغان پروفیسر آرنلڈ اور پروفیسر نکلسن نے مرتب کیا تھا اور اس کا نام "عجب نامہ" رکھا۔(۶)

اس موقع پر پروفیسر براؤن کے شاگردوں اور قدردانوں نے تہنیت نامے پیش کیے۔ اسلامک سوسائٹی کیمبرج نے عربی اور اعیانِ ایران نے فارسی میں جو مختصر ایڈریس ان کے سامنے پیش کیے تھے وہ مارچ ۱۹۲۲ء کے اوائل میں لندن سے دارالمصنّفین پہنچے تو مارچ کا معارف مرتب ہو چکا تھا۔ سید صاحب فرماتے ہیں: "تاہم اس ربط و خلوص کی ممنونیت کے اظہار کے لیے جو موصوف کو شبلی اکیڈمی کے ساتھ ہے، ان عربی اور فارسی ایڈرسوں کے بعینہٖ چربے "آثار علمیہ و ادبیہ" کے تحت میں درج کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی میں یہ سالگرہ کے مواقع سینکڑوں دفعہ پیش آئیں"۔(۷)

افسوس کہ چار سال بعد ہی ان کا وقت موعود آپہنچا اور ۵ جنوری ۱۹۲۶ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ سید صاحب کو اس المناک حادثے کی خبر ملی تو اسی مہینے کے معارف میں شذرات میں انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"موصوف نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ ایک بے تعصب عالم، ایک ہمدرد مستشرق اور ایک شریف انسان ہونے کے لحاظ سے بھی نہایت بلند درجہ تھے۔ قومی تنگ ظرفی اور مذہبی عصبیت سے وہ قطعاً مبرا تھے۔ ان آنکھوں کو یہ عزت حاصل ہے کہ انہوں نے مرنے والے کی زیارت کی تھی۔ آئندہ معارف میں ان کے کچھ حالات سپرد قلم ہوں گے۔ ہندوستان میں ان کو ہم سے بہتر جاننے والے اشخاص بلکہ ان کے شاگرد موجود ہیں، کیا بہتر ہو اگر ان میں سے کوئی صاحب ہماری مدد فرمائیں اور براؤن پر ایک عمدہ مضمون لکھ کر عنایت فرمائیں۔ اور اگر احباب پسند فرمائیں تو معارف کا ایک نمبر صرف براؤن پر شائع کیا جائے کہ ان کے احسانات کا یہ ادنیٰ ترین معاوضہ ہے"۔(۸)

کسی وجہ سے پروفیسر براؤن پر معارف کا نمبر نہ نکل سکا، البتہ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کے شمارے میں مولوی سید محمد طاہر رضوی بی اے (کلکتہ) کا ایک مختصر مضمون براؤن کے حالات وتصنیفات پر شائع ہوا۔

سید صاحب نے براؤن کے نام اپنے مکتوب کا آغاز علامہ شبلی، ندوۃ العلماء، شبلی اکیڈمی اور سیرت النبیؐ کے تذکرے سے کیا۔ پھر مزید تعارف اور تقریب ملاقات کے لیے مکتوب الیہ کی خدمت میں اپنی بعض تصنیفات بھیجنے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد اصل مضمون کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ جنگ عظیم اول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ سارے زمانے سے الگ خالص علمی کاموں میں منہمک تھے کہ اچانک اس ہلاکت آفریں جنگ نے ساری دنیا میں زلزلہ پیدا کردیا، امن وسکون کو خاک میں ملا دیا اور علم وفن کے گوشہ نشین خادموں کو بھی مجبور کردیا کہ وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نکلیں اور اسلام کے اس نازک ترین دور میں ان سے اس کی جو خدمت ہوسکے کریں۔ جنگ کا ابر سیاہ چھٹا تو امید تھی کہ صلح وامن کی روشنی پھیلے گی لیکن پردہ چاک ہوا تو مطلع اور زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔(۹)

اس کے بعد ترکی اور ایران کی علمی اور تمدنی اہمیت کا خصوصی ذکر یوں کرتے ہیں:

"ترکی اور ایران ہمارے تمدن، ہمارے علوم، ہمارے رسوم وآداب اور ہمارے بزرگوں کے متروکہ ذخیرہ کے محافظ تھے۔ اب جب کہ زمانے کے ہاتھوں نے ان کے ساتھ بھی کھیلنا شروع کیا اور یہ دونوں قریب تھا کہ ایک افسانہ بن کر رہ جائیں تو دفعتاً ہم گہری نیند سے جاگے اور عزم کیا کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور اتنا چیخیں کہ ظالموں کو بھی معلوم ہو جائے کہ اب مظلوم بھی کروٹ بدل رہے ہیں"۔(۱۰)

اس موقع پر علوم، تمدن اور آداب معاشرت کی تعمیر وترقی میں اسلام اور اہل اسلام کے زریں کارناموں سے مکتوب الیہ کی واقفیت کا حوالہ دیتے ہوئے سید صاحب نے یہ وضاحت کی کہ "یہ چیخ و پکار اور گریہ وزاری ٹرکی اور ایران کی تباہی پر نہیں ہے بلکہ ہمارے آنسو دنیا کی بڑی قوموں میں سے ایک بڑی قوم، دنیا کے بہترین تمدنوں میں سے ایک تمدن اور دنیا کے علوم وفنون میں بہترین علم وفن کی بربادی پر بہ رہے ہیں"۔(۱۱)

خلافت وفد اور اس کے مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انگلستان آج تمام اقطار عالم کا مرکز ہے اور لندن اس مرکز کا نقطہ ہے۔ صلح کی مجلس تیار بیٹھی ہے کہ دنیا کا کوئی نقشہ تیار کر کے معاہدات کے کاغذ پر مہر لگا دے۔ اس لیے ہندوستان کے ہندوؤں، مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ وہ اپنے کچھ نمائندوں کو بطور وفد ممالک یورپ میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً بھیجیں تا کہ وہ اہل ہند کے جذبات اور مطالبات کو صاف صاف ظاہر کر دیں"۔(۱۲)

اس کے بعد یورپ کے دوسرے فضلا اور ارباب سیاست کے علاوہ خاص طور پر پروفیسر براؤن نے مسلمانوں کی حمایت میں جو کوششیں کیں اور ان کے قلم سے انگلستان کے اخبارات میں جو مضامین شائع ہوئے ان کی زبردست ستائش کرتے ہوئے سید صاحب نے مسلمانان عالم کی جانب سے ان کا شکریہ ادا کیا، لندن میں وفد کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا اور یہ امید ظاہر کی وہ پوری قوت سے وفد کی مدد فرمائیں گے۔(۱۳)

سید صاحب کے طویل خط کے بعض ضروری مطالب انہی کے الفاظ میں یا ذرا اختصار کے

ساتھ یہاں اس لیے پیش کیے گئے ہیں کہ پروفیسر براؤن کا جوابی خط ان کی روشنی میں پڑھا جائے۔

خط کا خاتمہ اس دلی خواہش پر ہوتا ہے کہ پہلی فرصت میں وہ پروفیسر براؤن کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

سید صاحب فرماتے ہیں کہ پروفیسر براؤن اور پروفیسر مارگولیتھ دونوں کے جوابات انہیں ''موصول ہوئے تھے جو ان کے شخصی اخلاق و مزاج کے مطابق تھے۔ پروفیسر براؤن کا جواب نہایت شریفانہ تھا۔ انہوں نے اپنی ان کوششوں کا حوالہ دیا تھا جو ایران کی آزادی کے لیے کی تھیں اور انگریزوں کی موجودہ سیاست سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ پروفیسر مارگولیتھ کا جواب مختلف تھا۔ انہوں نے ترکوں کے مظالم کا حوالہ دے کر موجودہ انگریزی پالیسی کی حمایت کی تھی''۔(۱۴)

مارگولیتھ کے جواب کے بارے میں راقم کو علم نہیں کہ براؤن کے جواب کی طرح وہ بھی دارالمصنّفین میں محفوظ ہے یا نہیں۔ مارگولیتھ کا جو خط دارالمصنّفین کے میوزیم میں میری نظر سے گزرا ہے وہ ایک اور خط ہے جو سید صاحب کے خط کے جواب میں لاہور سے ۱۱/دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا گیا تھا۔

کیمبرج میں پروفیسر براؤن سے سید صاحب کی ملاقات ۳ مئی سنہ ۱۹۲۰ء کو ہوئی۔ اس ملاقات کا احوال انہی کی زبان سے سنیے:

> ''بڑی مہربانی سے ملے۔ برابر مجھ سے ازراہِ تلطف باتیں کرتے رہے۔
> فارسی زبان میں گفتگو رہی۔ ان کو ایران سے بے حد محبت ہے............ترکوں کی نسبت ان کا خیال تھا کہ یورپ کے اہل سیاست نے نوجوان ترکوں کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ تونس اور الجیریا کے مسلمانوں کی نسبت یہ کہتے تھے کہ فرانس ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا''۔(۱)

دوسری جگہ ایک حاشیے میں ان کتابوں کے بارے میں جو انہوں نے پروفیسر براؤن کو تحفے میں ارسال کی تھیں، رقم طراز ہیں:

> ''پروفیسر براؤن کی شرافت یہ ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کے پہنچنے پر شکر مندی کا اظہار کیا اور جب ملاقات ہوئی تو اپنی الماری کھول کر فرمایا کہ ان میں سے جو کتاب

چاہیں لے لیں۔ چنانچہ میں نے ان کی شائع شدہ کتابوں میں سے قزوینی کی اڈٹ کی ہوئی جہاں کشا جوینی کی تاریخ اٹھائی۔ موصوف نے اس پر اپنے قلم سے ہدیہ لکھا۔ گھر آ کر اس نسخے کو دیکھا تو وہ موصوف کا اپنا تصحیح کردہ نسخہ تھا مگر انہوں نے اس پر ذرا بھی بار کا اظہار نہیں کیا۔ یہ یادگار نسخہ اس وقت دارالمصنّفین کے کتب خانے میں ہے''۔(۱۶)

آئندہ صفحات میں پروفیسر براؤن کے مکتوب کے ساتھ اس یادگار ارمغان پر ان کی تحریر کا عکس بھی پیش کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر براؤن کا مکتوب کیمبرج سے یکشنبہ ۷ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کو لکھا گیا ہے۔ سید صاحب کا خط انہیں دو روز قبل ۵ مارچ کو موصول ہوا تھا۔ خط میں انہوں نے جنگ عظیم سے قبل اہل فارس کے حقوق کے لیے اپنی کوششوں اور ان کی ناکامی کا حوالہ دیتے ہوئے بین الاقوامی سیاست سے شدید مایوسی کا اظہار کیا ہے اور اسے ایک لاعلاج مرض قرار دیا ہے۔ روس سے ان کی سخت بیزاری اور نفرت لفظ ''منحوس'' سے عیاں ہے۔

خط میں سید صاحب سے ملاقات اور ان کے وسیع علم سے استفادے کی خواہش کا اظہار مکتوب نگار کے عالمانہ انکسار کا آئینہ دار ہے۔ یہ اعلیٰ اخلاق تاریخ جہاں کشا کے مذکورہ نسخے پر ان کی تحریر سے بھی آشکار ہے جس میں انہوں نے اپنے لیے ''ذرۂ بے مقدار'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

خط کے آخر میں پروفیسر براؤن نے سید صاحب کی زبانی علامہ شبلی کی باتیں سننے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے اور ساتھ ہی علامہ شبلی کو ہندوستان ہی نہیں پورے مشرق کے ''اکابر رجال'' میں شمار کیا ہے۔

اس موقع پر سید صاحب کے اسی سفر سے متعلق پروفیسر براؤن کے ایک اور خط کا تذکرہ کرنے کا جی چاہتا ہے۔ یہ خط جو فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے، سید صاحب کی لندن سے روانگی کے تین روز قبل ۲۹ راگست سنہ ۱۹۲۰ء کو لکھا گیا تھا۔ اس خط میں بھی براؤن کا انکسار ملاحظہ ہو کہ انہیں یہ رنج تھا کہ انگلستان میں سید صاحب کے قیام کے دوران وہ ایسے مصروف رہے کہ ''ان کے فضائل و کمالات سے مستفیض'' ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اسی خط میں انہوں نے شعرالعجم کے فارسی یا انگریزی ترجمے کی اشاعت پر زور دیا ہے۔ پھر علامہ شبلی کی زندگی میں ان سے ملاقات کا موقع نہ ملنے پر افسوس کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

''چقدر افسوس میخورم کہ نصیبم نشد آن بزرگوار را ملاقات کنم قبل از آنکہ ازیں

درالفنا بدارالبقا انتقال فرمایند"۔

یہ خط سید صاحب نے جنوری سنہ ۱۹۲۱ء کے معارف (ص ۷۷) میں شائع کردیا تھا اور علامہ شبلی سے متعلق یہ سطریں اس سے قبل ۱۹۲۰ء کے شذرات میں بھی چھاپ دی تھیں۔

پروفیسر براؤن اگرچہ فارسی اور اس کے بعد ایک مدت تک عربی کے پروفیسر رہے اور اسی حیثیت میں سبکدوش ہوئے لیکن ان کا سروکار بیشتر فارسی زبان سے تھا۔ تاہم انہوں نے سید صاحب کے عربی خط کا جواب عربی ہی میں دیا۔ خط کی زبان فی الجملہ فصیح و سلیس ہے۔ ایک دو جگہ فارسیت کا اثر ہے، خاص طور پر جہاں انہوں نے نا امید کے معنی میں یائس کے بجائے "مایوس" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

پروفیسر براؤن کا یہ مکتوب اس پہلو سے بھی اہم ہے کہ یہ عربی زبان میں ان کی مکتوب نگاری کے ساتھ ان کے سوادِ خط کا نادر نمونہ ہے۔ راقم کی نظر سے عربی میں ان کے خط کا ایک اور نمونہ بھی گزرا ہے۔ دیوان حافظ کا ایک ایڈیشن جرمن ترجمے کے ساتھ تین حصوں میں سنہ ۱۸۵۸۔ ۱۸۶۴ء میں ویانا سے چھپا تھا۔ پروفیسر براؤن نے جون سنہ ۱۸۹۲ء میں اس ترجمے کا ایک نسخہ G.R. Dampier (۱۷) کو تحفے میں دیا تھا۔ اس پر ہدیے کی عبارت میں گلستان کا درج ذیل عربی شعر:

فقدت زمان الوصل والمرء جاهل بقدر لذيذ العيش قبل المصائب

نہایت خوشخط اور مکمل اعراب کے ساتھ لکھا۔ اس کے بعد شعر کا انگریزی ترجمہ اور آخر میں قوسین میں شیخ سعدی کا نام درج کیا۔

پروفیسر براؤن کا جوابی مکتوب جیسا کہ اوپر گزرا، دارالمصنّفین میں محفوظ ہے لیکن سید صاحب کا وہ طویل خط کہاں ہے جس کا اردو ترجمہ بریدفرنگ کے پاکستانی ایڈیشن میں جو میرے پیش نظر ہے ساڑھے پانچ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے جو سید صاحب کے سفر کے دوران معارف کے مدیر تھے، مئی سنہ ۱۹۲۰ء کے شذرات میں لکھا ہے کہ سید صاحب کے مکاتیب ہر ہفتے موصول ہوتے ہیں اور لکھنؤ کے روزنامہ ہمدم کو اشاعت کے لیے دے دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد زیر نظر خط کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس سلسلے میں ان کے وہ خطوط (مع ان کے جوابات کے) قابل دید ہیں جو

انھوں نے پروفیسر براؤن (کیمبرج) اور پروفیسر مارگولس (اکسفورڈ) کے نام عربی زبان میں تحریر فرمائے تھے۔ان کا ترجمہ ہمدم میں نکل چکا ہے۔اگر ناظرین معارف کی خواہش ہوتو ان کی اصل آئندہ نمبر میں پیش کی جاسکتی ہے''۔(۱۸)

کاش مولانا دریابادی نے اس معاملے کو''ناظرین معارف کی خواہش'' پر موقوف رکھنے کے بجائے ان خطوط کی اصل اور ان کے جوابات دونوں معارف میں شائع کر دیے ہوتے تو یہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجاتے۔

بہرحال ترجمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کی دوسری عربی تحریروں کی طرح یہ خط بھی عربی زبان میں ان کی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہوگا۔اس قیمتی اور نادر خط کو تلاش کرنا چاہیے۔میرا خیال ہے یہ خط کیمبرج میں پروفیسر براؤن کے کاغذات میں ضرور محفوظ ہوگا۔اسی مضمون کا خط جیسا کہ سید صاحب نے ذکر کیا پروفیسر مارگولیتھ کو لکھا گیا تھا، وہ بھی امید ہے اکسفورڈ میں ان کے ذخیرے میں دستیاب ہوگا۔

معارف کے غیر عربی داں قارئین کے لیے پہلے پروفیسر براؤن کے مکتوب کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے (روزنامہ ہمدم کی فائلوں تک میری رسائی نہیں ورنہ ازسرنو ترجمے کی ضرورت پیش نہ آتی)۔اس کے بعد اصل خط کا عکس ملاحظہ فرمائیں۔

حواشی اور حوالے

(۱) یہ تین مطالبات تھے: ۱۔ٹرکی کے سلطان کی حکومت بحیثیت اس کے کہ وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہے، قسطنطنیہ، تھریس اور اناطولیہ اور آرمینیا میں مستقل و آزاد قائم رکھی جائے۔۲۔حجاز، شام، فلسطین اور عراق جس کے مجموعے کا نام جزیرۃ العرب ہے غیر اسلامی اقتدار سے محفوظ رکھا جائے اور اسلامی مقامات مقدسہ کی حفاظت کا جو وعدہ برطانیہ نے کیا تھا اس کو وہ پورا کرے۔ ۳۔ہندوستان کی آزادی کے لیے رائے عامہ ہموار کی جائے کیونکہ بلاد اسلامیہ کا تحفظ ہندوستان کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔ ملاحظہ ہو: برید فرنگ، سید سلیمان ندوی مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۹۷ء، ص ۱۳-۱۴۔(۲) ایضاً ص ۱۵۔(۳) ایضاً، ص ۲۲۱-۲۲۷۔(۴) معارف مارچ ۱۹۲۲ء، شذرات، ص ۱۶۲۔(۵) پروفیسر براؤن کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو؛ المستشرقون، نجیب العقیقی، دارالمعارف، قاہرہ ۱۹۸۰ء، جلد دوم، ص ۸۰-۸۲، موسوعۃ المستشرقین، عبدالرحمن بدوی، دارالعلم للملایین، بیروت ۱۹۸۹ء، ص ۵۱-۵۳۔(۶) دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عجب نامے میں سارے مضامین یورپی زبانوں میں ہیں۔مضمون نگاروں میں پروفیسر محمد شفیع واحد شخص ہیں جن کا تعلق مشرق سے ہے۔(۷) معارف مارچ سنہ ۱۹۲۲ء، شذرات،

ص ۱۶۲۔(۸)معارف جنوری سنہ ۱۹۲۶ء،شذرات ص ۷/ ۲۔(۹) بریدفرنگ ص ۲۲۳۔ ۳۳۴۔(۱۰)ایضاً،ص ۲۲۴۔ (۱۱)ایضاً،ص ۲۲۴۔ ۲۲۵۔(۱۲)ایضاً،ص ۲۲۵۔(۱۳)ایضاً،ص ۲۲۶۔۲۲۷۔(۱۴)ایضاً،ص ۲۲۲ حاشیہ۔(۱۵)ایضاً، ص ۹۳۔(۱۶)ایضاً،ص ۲۲۳۔(۱۷)جی۔آر۔ڈیمپیر کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے۔نومبر سنہ ۱۸۹۲ء میں ہندوستان پہنچے اور ''صوبہ جات متحدہ آگرہ اوراودھ'' میں جوائنٹ مجسٹریٹ اور دوسرے عہدوں پر فائز رہے۔ملاحظہ ہو: The India List and India Office list, London,1905,PP:55-56,476. (۱۸)معارف مئی سنہ ۱۹۲۰ء،شذرات ص ۳۲۳۔

پروفیسر براؤن کے عربی خط کا ترجمہ

اتوار، ۷مارچ سنہ ۱۹۲۰ء

سیدی العلامۃ المفضال المکرم

دوروز قبل گرامی نامے سے سرفراز ہوا۔ جواب نہ دے سکا کہ بعض دوسرے کاموں میں مشغول تھا۔ایک سبب صحت کی خرابی بھی تھی جواب بحمدہ تعالیٰ تقریباً دور ہوگئی ہے۔

میرے بارے میں آپ نے جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے اس کے لیے بہت شکر گزار ہوں، باوجود اس کے کہ خود کو ان اوصاف کا مستحق نہیں سمجھتا۔بہر حال میرا حوصلہ میری طاقت سے بڑھ کر ہے۔ جنگ سے پہلے برسہا برس تک میں نے ایرانیوں کے حقوق کے حصول اور منحوس روس کی شر انگیزیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود حقوق جس طرح ہڑپ کیے گئے اور جو خوں ریزی ہوئی اس کے بعد میں ہر اس معاملے سے مایوس ہو چکا ہوں جو بین الاقوامی سیاست سے تعلق رکھتا ہو۔ایک لاعلاج مرض کی فکر کرنے کے بجائے اب میں نے اپنی توجہ ان عملی مقاصد کی جانب مبذول کرلی ہے جن کا رشتہ روحانی اور عقلی دنیا سے ہے۔

معلوم نہیں آپ کا قیام ہمارے ملک میں کب تک رہے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا، آپ کے وسیع علم سے استفادہ کروں گا اور آپ کی زبان سے مرحوم شبلی نعمانی کی باتیں سنوں گا جو میرے نزدیک ہندوستان ہی نہیں پورے مشرق کے اکابر رجال میں سے ایک تھے۔

آخر میں میرا پر خلوص سلام قبول فرمائیں۔

والسلام

دعا گو

اڈوارڈ برون

(دستخط)

يوم الأحد السابع من شهر مارت الافرنجي سنة ١٩٢٠

FIRWOOD.
TRUMPINGTON ROAD,
CAMBRIDGE

سيدي العلامة المفضال المكرم

قد تشرفت بكتابكم الكريم قبل
يومين و لم أجبه قبل الآن بسبب
اشتغالي بأمور اخرى و ايضاً بسبب
انحراف حصل في مزاجي يكاد أن يرتفع
الان عني تعالى؛

أشكركم كثيراً على حسن ظنكم فيّ مع
انني لا أرى نفسي لائقة لهذه الاوصاف وعلى
كل حال همتي فوق قوتي و بعد ما بذلت
جهدي مدة سنين قبل الحرب في طلب
حقوق الفرس و اظهار مفاسد الروس
المخوس و مع هذا كان ما كان من غصب

الحقوق و سفك الدماء، اصبحت
مايوساً من كلما يتعلق بالسياسة
بين الملل و تركت الاهتمام بمرض لا
شفاء له و توجهت الى المقاصد العلمية
المتعلقة بعالم الأرواح و العقول

لا اعلم كم تقيمون في بلادنا و لكن
أرجو أن أتشرف بلقائكم الشريفة و استفيد
من علمكم الواسع و أسمع من حضرتكم روايات
الشبلي النعماني المرحوم الذي هو عندي من اكابر
رجال الهند بل المشرق كله
تقبل في الختام خالص تحيتي والسلام

الداعي
ادوارد براون
Edward G. Browne

مولانا سید سلیمان الندوی
از طرف این ذرهٔ بمقدار
ادوارد براون
بطریق یادگار و ارمغان داده شد

کتاب
تاریخ جهانگشای
تألیف
علاء الدین عطاملک بن بهاء الدین محمد بن محمد الجوینی
در سنهٔ ۶۵۸ هجری
جلد اوّل
در تاریخ چنگیز خان و اعقاب او تا کیوک خان
بسعی و اهتمام و تصحیح اقلّ العباد
محمد بن عبد الوهاب قزوینی
با نضمام حواشی و فهارس
در مطبعهٔ بریل در لیدن از بلاد هلاند بطبع رسید
سنهٔ ۱۳۲۹ هجری مطابق سنهٔ ۱۹۱۱ مسیحی

وفیات

جناب فاخرؔ جلال پوری مرحوم

(۱۹۳۴-۲۰۱۹ء)

جلال پور کی سرزمین شاعروں اور ادیبوں کے تعلق سے بڑی نیک نام ہے۔ اس نیک نامی کی ایک عمدہ مثال حضرت فاخرؔ جلال پوری کی ذات بابرکات ہے۔ افسوس کہ ۱۴؍ جون کو یہ قابل قدر اور نہایت متواضع اور خاکسار شخصیت آسودہ خاک ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ان باکمال ہستیوں میں تھے جن کے کمال کا سورج گوشہ نشینی اور فروتنی کے بادلوں میں چھپا سا رہتا ہے لیکن جو ان سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے آنکھیں اسی درجہ خیرہ ہو کر رہتی ہیں۔

وہ شاعر تھے اور استاد شاعر تھے۔ حمد و نعت و منقبت میں وہ غزلوں اور نظموں سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی ایک کتاب ''آسماں ایسے ایسے'' مختصر سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ نہایت سادہ اور آسان اسلوب میں انہوں نے جن شخصیتوں کو دیکھا اور جیسا پایا، سب اپنے پاک قلم کے حوالے کر دیا لیکن ان کے قاری کے لیے یہ تحریریں خود ان کے مرقع میں ڈھل گئیں۔ عقیدت و اعتراف اور استفادہ کی وسعت دیکھیے کہ قاری صدیق باندوی، مولانا کوثر ندوی، حافظ ملت مولانا عبدالعزیز، مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے ساتھ کامریڈ اکبر حسین بابر سبط محمد نقوی، سوامی اکشے برہمچاری ہیں تو کیفی و وامق اور فضا ابن فیضی اور ابوالمجاہد زاہد بھی ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان ناموروں کے تذکرہ کو پروفیسر سید عبدالباری مرحوم نے موجودہ نسل پر احسان سے تعبیر کیا۔ حقیقت یہی ہے کہ علم، فضل، لیاقت، شرافت اور نافعیت کی قدر کرنے کا جو انداز و معیار فاخرؔ صاحب مرحوم نے وسعت قلب و نظر سے پیش کیا اور خود پوری زندگی اس کو برتا وہ بھی آنے والی نسلوں کے لیے تقلید کے لائق ہے۔

ان کی شاعری اور نثر نگاری خود مشتہری سے بے نیاز رہی لیکن ''آیات حرم'' ہو، ''دانائے سبل''

ہو یا ''لب فرات''، پھر ''برگ وساز''، ''حرف زار'' ہو یا ''نگار غزل'' اور ''زیتون کے سائے''، یہ تمام مجموعے زبان، مضمون، فکر اور ادا ہر لحاظ سے اردو زبان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی کرتے رہے۔ حرف زار میں ان کی ایک نظم ''سفر تمام ہوا'' گویا الہامی نظم ہے جس میں ہر مصرعہ ان کی کتاب زندگی کی سرخی بن گیا۔ ''میں مطمئن ہوں/ مری زندگی کا ہر لمحہ/ مرے میزان احتساب میں تھا/ خدا کا شکر بایں احتیاط گذری عمر/ کہ آشیاں کسی شاخ شجر پہ بار نہ ہو/ عزیزو، ہم نفسو!/ لو سفر تمام ہوا''۔

یقیناً زندگی کا دنیوی سفر تمام ہوا لیکن انہوں نے سخت راہوں، آنسوؤں، آہوں، ناکردہ گناہوں سے بھرے اس سفر کو بزرگوں اور خانقاہوں کے فیض کے ذریعہ جس طرح آسان کیا اس نے ایک عام سادہ اور اپنے دائرہ میں محدود زندگی کو مطالعہ کے لائق بنادیا، بڑے ناموں کے ساتھ بڑے افسانے کچھ اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ قلم کو ماحولیات کی کثافت سے دور کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن فاخر صاحب مرحوم، عرف عام میں بڑے نام والے نہ تھے، وہ پیشہ ور صاحب قلم نہ تھے اس لیے پیشہ ورانہ شہرت سے دور رہے، حق یہ ہے کہ علم کے قدرداں تھے، مصنف سے زیادہ عمدہ قاری تھے۔ آج مصنفوں کا بازار گرم ہے لیکن اس گرمی بازار میں قاری کی آہٹ تک نہیں ملتی، خدا جانے کہاں گم ہو گیا، ایسے میں فاخرؔ صاحب مرحوم جیسے علم کے قدردانوں کی کمی، وحشت و ویرانی کچھ اور بڑھا جاتی ہے۔

دارالمصنّفین سے ان کے قلبی روابط دیرینہ تھے، وہ ۶۹ء میں پہلی بار دارالمصنّفین آئے اور اس کو اپنی آنکھوں میں اس طرح بسایا کہ پھر کوئی اور نقش اس عکس کو مٹا نہ سکا۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کو انہوں نے منکسر المزاج، وضعدار، صوفی صفت، خلیق و نرم خو لکھا، حق یہ ہے کہ دیکھنے والے ان کو ان ہی صفات کا پیکر سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرما کر مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان خصوصاً ڈاکٹر آفاق فاخری اور ان کے بھائی بہنوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(ع۔ص)

ادبیات

غزل

جناب وارث ریاضی

زمانے کے ہر غم کو میں نے بھلایا
سکوں دل کو لیکن میسر نہ آیا

جفا سے تری جب لگی آگ دل میں
وفاؤں کے اشکوں سے اس کو بجھایا

تری یاد ہے نقش لوحِ جبیں پر
ترے غم کو قلب و نظر میں بسایا

خدا جانے کس کی اداؤں کے صدقے
مرا ذوقِ شعر و سخن جگمگایا

مری حالت زار پر خوش ہے دنیا
مری بے کلی پر فلک مسکرایا

بہاروں کا اعجاز اللہ اکبر
کہ صحن چمن میں ہے کانٹوں کا سایا

کہانی مری درد آگیں ہے لیکن
سنی جس نے اس کو بڑا لطف آیا

توقع نہیں مجھ کو اپنوں سے کچھ بھی
پرایا تو ہوتا ہے وارثؔ پرایا

☆......☆

☆ کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن (بہار) Mob: 8228902548

کربِ صدا

جناب محمد طارق غازی

تم چیخ رہے ہو کہیں ہم چیخ رہے ہیں ہر رہ گزر شہر میں بم چیخ رہے ہیں
چہروں پہ ہے صدمات کی مغموم سی تحریر آنکھوں کی خموشی میں الم چیخ رہے ہیں
اظہار مسرت سے بھی ڈر لگتا ہے اب تو کیا جشن کریں جشن میں غم چیخ رہے ہیں
پھیلا کے دماغوں میں فساد اہل زمیں کے سلطان و امیرانِ حرم چیخ رہے ہیں
بس شبہ کہ شیطان کا ہرکارہ ہے ہر شخص ابلاغیہ میں اہل ستم چیخ رہے ہیں
جادوگروں نے کردیا ہر رائی کو پربت جو زیادہ فسوں کار ہیں کم چیخ رہے ہیں
اک سمت مناروں کی شہادت ہے سخن سوز اک سمت شوالوں میں صنم چیخ رہے ہیں
پندار میں محبوس، گرفتار انا لوگ جو کچھ نہیں دنیا میں منم چیخ رہے ہیں
دجالی خیالات کا طوفان ہے ایسا سب دیر و کلیسا و حرم چیخ رہے ہیں
ہرسکہ کی قیمت ہے سرافگندۂ کاغذ بازار نگوں، دام و درم چیخ رہے ہیں
امداد کے انباروں پہ بیٹھے ہوئے کرگس خود ساختہ سب اہل کرم چیخ رہے ہیں
اے کاش یہاں سطروں پہ ہو ''ن''[ا] کا سایہ بے وجہ جہاں اہل قلم چیخ رہے ہیں

حق کس سے سنیں، کس سے کریں عشق یہاں ہم
آزردہ مؤذن ہیں، صنم چیخ رہے ہیں

☆......☆

ا ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (القلم ۶۸:۱)۔ مفسرین کا بیان ہے کہ (ن) سے دوات بھی مراد ہے۔

مطبوعات جدیدہ

کودرا، جناب راشد شاذ، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ملی پبلی کیشنز، ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵۔

جناب راشد شاذ کے افکار وخیالات کی اپنی ایک خاص ڈگر ہے جس کی منزل معلوم ہوتے ہوئے بھی گویا معدوم ہے۔ قدم قدم پر عروج وزوال، دل بستگی ودل شکستگی کی داستانوں پر مشتمل اسلام یا مسلمانوں کی مذہبی، معاشی، سیاسی تاریخ کے مطالعہ وتجزیہ کی راہ واقعی کٹھن ہے جس کا اندازہ مصنف موصوف کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ اب فکری سفر میں مقاماتی سفر بھی شامل ہوگئے۔ زیر نظر کتاب سے پہلے ایک کتاب لستم پوخ آئی تھی جس کا تعارف یہ کہہ کر کیا گیا تھا کہ ''روحانیوں کے عالمی پایہ تخت استنبول میں گیارہ دن''، کہا گیا کہ کتاب کے مشمولات حقیقی مشاہدات ہیں، اس دعویٰ سے قطع نظر اسلوب اور بیان کے لحاظ سے اس میں وہی لطف آیا تھا جو کبھی ظفر عمر بی اے کی نیلی چھتری اور بہرام کی واپسی میں ملتا تھا۔ حیرت، استعجاب، ناقابل یقین عقائد اور اس سے زیادہ دہشت ناک روایات اور کچھ ایسی تعبیرات جن سے اردو والے کم ہی آشنا، مثلاً آوازوں کے سحر گزیدہ، صدا گزیدہ، ان تعبیرات کی تشریح البتہ کچھ مانوس تھی، جیسے ''اگر صوفیہ کی محفلوں کی رونق ہاؤ ہو کی طرب ناک آوازوں کے سہارے قائم ہے تو اہل تشیع کے ہاں جذبات کی گرم بازاری کا سارا کاروبار دراصل منقبت حسینؓ، نوحوں اور مرثیوں کے دم سے چلتا ہے، یہ سب نہ ہو تو فکری التباسات کے یہ مختلف خیمے جو شعر ونغمہ کی بدولت قائم ہیں اپنی جاذبیت کھودیں''۔ لستم پوخ میں مرکزی موضوع تصوف تھا۔ باہر سے مشاہدہ سے زیادہ اندر کے تجربہ کا معاملہ تھا، بیان میں شیعوں کا ذکر ہونا ہی تھا۔ اب کودرا نامی کتاب آئی تو یہ بھی گرچہ سفرنامہ ہے اور سفر بھی اسی استنبول کے دیار کا، بڑا عجب معاملہ ہے کبھی شرق اوسط ہمارے مفکرین کی سرزمین تجزیہ تھی، اب مفکرین اسلام کی ایک جماعت بلقان سے فیضان میں زیادہ ایقان رکھتی ہے۔ یہ اساطیریت بھی کیا چیز ہے، استنبول ہو یا قلعہ بورل ہو، فکر جدید، اساطیری ہیولوں کے سایہ کے بغیر تاریخ کے نقوش پانے میں جیسے کامیاب ہی نہیں ہوسکتی، راشد شاذ کو ایسا ہی ایک انسانی ہیولیٰ علی کودرا کی شکل میں ملا اور وہی اس سفرنامہ کا مرکزی موضوع وکردار ٹھہرا، بیدار مغز، پرسوز دل، بیک وقت شیعہ بھی اور سنی بھی، لیکن عجیب سی نفسیاتی بے کلی کی تصویر، لگتا ہے مصنف کو اپنا ہم نفس اور ہمزاد مل گیا، جس

کے علم وفکر کے تھپیڑوں سے فرقہ وارانہ منافرت کی دیواریں گرتی معلوم ہوتی ہیں اور جس کی وجہ سے خود مصنف کو یہ دعویٰ کرنے کا حوصلہ ملتا ہے کہ شاید یہ پہلی تصنیف ہے جو شیعہ یا سنی موقف کو احق ثابت کرنے کے بجائے دونوں ہی کو پوری شدت سے مسترد کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ فرقوں کی بقا دراصل اسلام کی موت ہے۔ دعویٰ جیسا بھی ہو قاری کو تلاش رہتی ہے کہ فرقوں کی ایسی فنائیت جس میں اسلام کی زندگی مضمر ہے، آخر ہے کہاں؟ چودہ پندرہ سو سال سے اس کی کوشش کیوں نہیں ہوئی۔ لے بلند ہو تو صاف سنائی دے کہ کفر ونفاق وزندقہ کے فرقے اگر باقی ہیں اور باقی رہے تو کیا یہ بھی اسلام کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ اسلام کے تمام علمی وثقافتی وتہذیبی اور ان سب پر مشتمل سیاسی شعبے اگر دریا برد کردیے جائیں تو پھر کون سا اسلام کو درا یا ان کے ہمزاد پیش کرسکتے ہیں؟ یہ کہنا ایک نعرہ سے زیادہ نہیں کہ "تاریخ وتعبیر کی اتباع میں گیارہ صدیاں ضائع ہوگئیں، اب تجربے نے بتادیا کہ وحی کی مشایعت کے بغیر ہم کامران نہیں ہوسکتے"۔ لستم پوخ سے کودرا تک کا سفر اس لحاظ سے تقلیب انگیز ضرور ہے کہ پہلے صرف کناروں کی بات تھی، اب کنارے ملنے کی بات ہے خواہ یہ ناممکن ہی کیوں نہ ہو۔ درمیان میں چونکانے والے اشارے جابجا ہیں، جیسے احیائے اسلام کی خواہش کو ایرانی اور سعودی دونوں نے ہائی جیک کرنے کی کوشش کی، دیکھتے ہی دیکھتے تنگ نظری، تعصب اور منافرت نے معصوم مسلمانوں پر اپنی کمندیں ڈال دیں۔ ایک اشارہ یہ بھی کہ فرد، گروہ اور فرقہ جب تک امت نہیں بنتے ان کے فکری سفر میں بہت سے ایسے کرب ناک لمحات آتے ہیں جب یہ اپنے آپ کنٹرول کھودیتے ہیں، کتاب میں ایک باب مسدود راستے کے عنوان سے ہے۔ ایک معلم و ماہر معاشیات نے مسروقہ مستقبل کے نام سے گفتگو کرتے ہوئے انسانوں کے مستقبل پر سرمایہ دار غاصبوں کے شب خوں کی جو داستان سنائی وہ بار بار پڑھنے کے لائق ہے، خاص طور پر موجودہ ہندوستانی سیاست کو سمجھنے میں حقیقت پوری طرح خود کو عیاں کرتی نظر آتی ہے۔ سرمایہ داروں کی غارت گری، انسانی معاشرہ میں ایک بے سمتی اور عدم معنویت جس طرح پیدا کرتی ہے اس کا بیان واقعی دل گرفتگی کا سبب ہے۔

مصنف کے خیالات ردوقبول کی حدوں سے باہر نہیں لیکن روایتی فکروانداز سے انحراف بھی یکسر ردوانکار کی اجازت نہیں دیتا۔ اردو میں ایسی کتابیں کم ہی آتی ہیں، کچھ اور نہ حاصل ہو جدت افکار اور لذت گفتار سے شادکام تو ہوا ہی جاسکتا ہے۔

دانش راہ ہیں (نذر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی)، مرتب: جناب محمد حارث بن منصور، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۶۹۲، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ اور دہلی، گورکھپور، پٹنہ، سری نگر اور الہ آباد کے مشہور مکتبے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین، عابد حسین، کرنل بشیر زیدی، حکیم عبدالحمید جیسی شخصیتوں کی قابل فخر و رشک اور واقعی بے مثال خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا۔ یہ سلسلہ کچھ رک سا گیا تھا، زیر نظر کتاب آئی تو ایک مفید رسم کے زندہ کرنے کا خوشگوار احساس ہوا کہ احساسات کا یہ معطر تحفہ ایک ایسی شخصیت کے لیے خاص کیا گیا جس نے اوروں کی نسبت کم عرصہ میں ایسے کارنامے انجام دیے اور اپنی شخصیت کی بوقلمونی اور رنگا رنگی سے اضداد کو اتحاد و اجتماع میں اس طرح بدلا کہ اس کا وجود واقعی حیرت سرا بن گیا۔ مولانا دریابادیؒ نے نواسہ کا نام رحیم و رحمانی خدا جانے کس مبارک وقت میں تجویز کیا کہ یہ صفت عبدالرحیم قدوائی کی زندگی کے ہر مرحلہ پر ساتھ ساتھ نظر آتی ہے، تعلیم خواہ علی گڑھ کی ہو یا لندن کی، پروفیسری شعبہ انگریزی کی ہو یا ڈائرکٹری اکیڈمک کالج کی، رحمتیں جیسے ان کے لیے خاص طور پر اترتی اور بکھرتی رہیں۔ ہاتھ میں جو کام آیا گویا اس کو ید بیضا حاصل ہو گیا، انگریزی زبان و ادب کی مہارت، قرآنیات و اسلامیات کی خدمت میں کس طرح بدل گئی، عظمتوں کی ہر اڑان نے کس طرح زمین سے ان کو دور نہیں کیا، اس کے اسباب تو وہی بتا سکتے ہیں جنہوں نے ان کو قریب سے دیکھا، دوسروں کے لیے نذر و نذرانہ کی نافعیت اسی میں ہے کہ ان سے خود اپنی راہوں کا تعین کیا جائے۔ زیر نظر کتاب میں حکیم ظل الرحمٰن صاحب، پروفیسر توقیر عالم فلاحی، پروفیسر غضنفر، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی اور ڈاکٹر ابرار احمد قاسمی نے بڑی خوبصورتی سے آئینے سجا دیے ہیں، درجنوں انگریزی، اردو کتابوں کے مصنف اور اس سے زیادہ قرآن کریم پر موسوعی شان کے محقق کے بارے میں حکیم ظل الرحمٰن صاحب نے بجا طور پر اہمیت ان کاموں کو دی جو قدوائی صاحب نے سرچشمہ دین یعنی قرآن مجید کے حوالہ سے انجام دی ہیں، روایتی انداز میں کتاب میں ایسے مقالات بھی ہیں جن کے موضوعات سے قدوائی صاحب کو خاص تعلق رہا ہے، یہ تمام تحریریں گویا نہایت خوشنما پھول ہیں، یہ اور بات ہے کہ سرسبد گل کی نسبت نے ان کو روح میں بسا لینے کا درجہ دے دیا۔

زیر نظر کتاب ہی کی طرح جناب فاروق ارگلی نے بھی مجاہد علم و عمل پروفیسر عبدالرحیم قدوائی

کے نام سے ایک اور کتاب مرتب کی جس میں شخصیت کے علاوہ قدوائی صاحب کے منتخب مضامین اور ان کی کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ ترتیب کا سلیقہ دونوں میں نمایاں ہے۔ حالانکہ ایک مرتب نہایت کہنہ مشق صاحب قلم ہیں جب کہ دوسری کتاب کے مصنف ابن منصور ابھی کوچۂ تالیف میں نووارد ہیں۔ نئی نسل کے لیے جو حقیقی عظمت و رفعت کی چاہ اور راہ میں ہے اس قسم کی کتابیں مشعل بھی ہیں اور مثال بھی۔

خطوط مولانا محمد عمران خان ازہری بنام مسعود الرحمٰن خان ندوی ازہری، مرتب پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت، عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۷۲، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ دین دانش ۱۳۔ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔۱۔

عالم، معلم، منتظم کی حیثیت سے مولانا محمد عمران خاں ندوی کی شہرت محتاج بیان نہیں، ندوہ، تاج المساجد، تبلیغی جماعت ہر جگہ ان کے نقوش انمٹ ہیں، لیکن ان کے علمی، ادبی، تربیتی اور روحانی کمالات کو اگر تغافل کا شکوہ ہے تو یہ بجا و برحق ہے۔ شکر ہے کہ ادھر چند برسوں سے مولانا کے خطوط کو جمع کرنے اور تدوین و حواشی کے ساتھ شائع کرنے کی سعادت ان کے ذی علم اعزہ کو ملی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ مجموعہ ہے جو مولانا کے برادرزادہ و خویش کے نام خطوط پر مشتمل ہے۔ مسعود صاحب مولانا کے نہایت معتمد معاون اور مستشار بھی ہیں۔ ان کو یہ احساس ہے کہ بہت سے امور کے بارے میں ان خطوط کی حیثیت ریکارڈ کی ہے، اس لیے ان کی حفاظت کی شکل یہی ہے کہ ان کو شائع کیا جائے ظاہر ہے زیادہ تر معاملات ان لوگوں کے لیے زیادہ دلچسپ ہیں جن کا تعلق بھوپال سے ہے لیکن جا بجا وہ مقامات بھی ہیں جہاں مولانا کی بلندیِ کردار کا منظر بڑا دلکش ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے انتقال پر مولانا کے شدید غم کا یہ حال تھا کہ خانہ کعبہ کی چوکھٹ ملتزم پر ان کی مغفرت اور علوئے درجات کی دعا کی، اس کا سبب بھی بیان کیا کہ اعلان و اشتہار کی دنیا میں خاموشی سے کام کر دینے والوں، چپکے سے دردمندوں کے کام آجانے والوں اور نیکی کر دریا میں ڈال پر عمل پیرا ہونے والوں کی واقفیت بھی لوگوں کو نہیں ہو پاتی اور ہو تو کچھ قدردانی بھی لوگ نہیں کر پاتے۔ ایک جگہ بھتیجے کو یوں نصیحت کی کہ دعا و صلوٰۃ حاجت کو اپنی اساس اصلی بناؤ کہ بلا فضل الٰہی کے کوئی سعی منتج نہیں ہوتی۔ ایک جگہ لکھا کہ...... حدیث شریف میں آتا ہے کہ تم اپنے مال سے سب کو راضی نہیں کر سکتے لیکن اپنے اخلاق سے سب کو

رام کر سکتے ہو۔ملازمت میں ہمیشہ وہ آدمی کامیاب رہے ہیں جنھوں نے ابتدائے کار میں محنت ومجاہدۂ شاقہ برداشت کرلیا، پھر آگے تسہیلات آتی ہیں۔جگہ جگہ اس قسم کی کارآمد باتیں بڑے مؤثر انداز میں آ گئی ہیں۔فاضل مرتب نے بعض مقامات پر حواشی بھی دیے ہیں جو کہیں کہیں غیر ضروری لگتے ہیں۔ انسانوں کو جاننے اور ان سے زندگی کے گُر سیکھنے والوں کے لیے اس مجموعہ کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

ظفر اوگانوی حیات وادبی خدمات از ڈاکٹر دبیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۲، قیمت ۳۵۰روپے، پتہ: اقدار کتاب گھر، ۸۔اے، شمس الہدیٰ روڈ، کولکاتا۔۱۷، اور عثمانیہ بک ڈپو، ۲۵۔رابندراسرانی، کولکاتا اور پٹنہ، علی گڑھ کے مشہور مکتبے۔

بہار کے علاقہ بہار شریف کی شرافت اس خطہ کی چند ایسی بستیوں کی دین ہے جن کا ذکر اردو کے ادب عالیہ کی تاریخ میں ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔ان ہی بستیوں میں ایک اوگانواں بھی ہے۔علماء، ادباء وشعرا کی ایک بڑی جماعت یہیں سے اٹھی اور خدا جانے کہاں کہاں علم ونور کی بارش کر گئی، اس جماعت میں ایک نام جناب ظفر اوگانوی مرحوم کا ہے، صفیر بلگرامی پر ان کے تحقیقی مقالہ کو بڑی داد ملی۔ محقق ونقاد کی حیثیت سے ان کی پہچان ہوئی۔شاعر ومعلم ومدیر ہوئے لیکن انھوں نے علامتی اور بیانیہ افسانہ نگاری میں زیادہ توجہ حاصل کی۔زیر نظر مقالہ میں بھی اسی پہلو کو گویا مرکزیت حاصل ہے، لائق مصنف نے بڑی شائستہ زبان واسلوب میں تحقیق کا فریضہ انجام دیا۔

ظفر اوگانوی سے قبل کی ادبی روایت، یہ باب اول ہے جو بڑی محنت کا ثمرہ ہے۔اس میں علامہ شبلی کا ذکر بڑی دقت ومہارت سے کیا گیا۔فاضل مصنف نے لکھا کہ شبلی میں ظرافت کا مادہ بھی تھا لیکن ان کے برعکس حالی جب ظرافت سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکامی ان کے حصہ میں آتی ہے جب کہ شبلی کی ظرافت محدود ہوتے ہوئے بھی بہت کامیاب وکامران ہے۔ان کے نزدیک شبلی کی شاعری مسلک اور موضوع اور اسلوب پر اعتبار سے ایک خاص انداز رکھتی ہے، اس کا تیور نہ حالی کے ہاں ہے نہ اکبر کے ہاں۔

ایک نسبتاً کم مشہور لیکن ذی علم، پختہ قلم اور صائب فکر شخصیت کو اس کے دور کے پس منظر میں خوبصورتی سے پیش کیے جانے کی وجہ سے یہ کتاب اپنے وجود کا اعلان بہتر طور پر کرتی نظر آتی ہے۔

اشاریہ برہان دہلی از جناب محمد شاہد حنیف، قدرے بڑی تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۷۲، قیمت ۸۰۰ روپے، پتہ: کتاب سرائے اردو بازار لاہور، فضلی سنز، اردو بازار، کراچی، پاکستان۔

برہان کا جوذکر آیا تو دل پروہی گزری جس کی تعبیر سینہ پر تیر مارنے سے زیادہ نہیں ہوسکتی، اردو کی علمی تحقیقی، ادبی، فکری حکمرانی کی تاریخ میں معارف کے ساتھ برہان کا نام بے اختیارانہ آجاتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں جب معارف کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس وقت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے برہان جاری کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ برہان ساطع بن گیا، وجہ شاید یہ بھی تھی کہ جن مقاصد کو معارف نے پیش نظر رکھ کر سفر شروع کیا تھا، کم و بیش برہان نے ان ہی کو زادراہ بنایا، بڑی بات ہے کہ برہان نے قبول عام کے لیے کسی خاص جماعت کا آلہ کار بننا کبھی گوارا نہیں کیا، مولانا اکبر آبادی کے علمی مزاج میں جو رواداری اور وسعت تھی اس کی وجہ سے خود معارف والوں نے ان کی ادارت کو خراج تحسین پیش کیا، برہان اور برہان والوں کے لیے بیسیوں تحقیقی مقالے درکار ہیں اور اس کے لیے برہان کے ایک مکمل اشاریہ کی ضرورت ہمیشہ رہی۔ بہت پہلے جناب عابد رضا بیدار کی بیدار مزاجی نے اس قسم کی کوشش کی تھی لیکن ہر نقش اول، بہتر اور خوب تر کا منتظر رہتا ہے، زیر نظر اشاریہ اسی انتظار کا بہترین اظہار ہے، اشاریہ نگار کے تعارف سے معلوم ہوا کہ اشاریہ سازی ہی ان کی زندگی ہے، پاکستان کے بیشتر علمی و مذہبی رسائل کے اشاریوں کو ترتیب دے کر وہ واقعی اس صنف علمی کے سب سے نمایاں مشار الیہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس اشاریہ میں حسن ترتیب ان کے تجربات کا نتیجہ ہے، پروفیسر انس احسان اور پروفیسر ہمایوں عباس شمس کے اس احساس میں ہم بھی شریک ہیں کہ ندرت، انفرادیت اور جدت نے اس اشاریہ کو دوسروں سے کہیں زیادہ کامیاب بنادیا ہے۔ اشاریہ کا سب سے بڑا مقصد یہی بتایا جاتا ہے کہ محققین و طالبین کے لیے متعلقہ رسالہ سے مطلوب معلومات کم سے کم وقت میں بہ آسانی فراہم ہوجائیں، جیسے اسی اشاریہ میں ان مقالات کا ذکر ہے جن میں کئی موضوعات ہوتے ہیں، جیسے امریکا کے حوالے سے اگر پاکستان، عراق، افغانستان وغیرہ کے ضمن میں معلومات ہیں تو امریکا کے ساتھ ان ملکوں کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا۔ بقول مرتب زیادہ سے زیادہ موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے۔ برہان کے اس اشاریہ کے قدرداں ہندوستان میں کم نہ ہوں گے، اس لیے اس کی ہندوستانی اشاعت کی سبیل نکالا چاہیے۔

(ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

بِہار کی بَہار عظیم آباد: (بیسویں صدی میں) اعجاز علی ارشد، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

قیمت: ۱۸۰/روپے

بِہار کی بَہار (جلد دوم): اعجاز علی ارشد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

قیمت: ۱۵۰/روپے

ترجمان القرآن الکریم: ترجمانی و تفہیم، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرتب احمد ابوسعید، اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔

ہدیہ: ۵۰/روپے

سہرے کی ادبی معنویت: ڈاکٹر امام اعظم، بک امپوریم اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔

قیمت: ۳۵۰/روپے

قرآن کی روشنی میں: مولانا محمد ثناء اللہ عمری، ڈور نمبر ا، فرنچ پٹ مچھلی پٹنم۔ قیمت درج نہیں۔

قرآنیات (حصہ اول): مولانا نعیم الدین اصلاحی، ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس۔۴۵۵، پرانی حویلی حیدرآباد۔

قیمت: ۴۹۰/روپے

مشاہیر علوم اسلامیہ اور مفکرین و مصلحین: پروفیسر محسن عثمانی ندوی، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، B - 35 نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔

قیمت: ۳۲۵/روپے

مشاہیر کے خطوط: (ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن کے نام)، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، پرویز بک ڈپو، سبزی باغ، پٹنہ۔

قیمت: ۲۵۰/روپے

نقوش افکار: جناب محمد شاہد محمود پوری، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ قیمت: ۳۰۰/روپے

نقوش عمل: : جناب محمد شاہد محمود پوری، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ قیمت: ۳۰۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print

August 2019 Vol - 204 (2)

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP-43/019

Monthly Journal of

Darul Musannefin Shibli Academy

P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

مطبوعات شبلی صدی

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۶۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۷۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۸۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۹۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۰۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۱۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۲۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۳۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۴۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۵۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۶۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۷۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۸۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۱۹۔	الندوہ (جلد ۱۔۹)		4735/-